رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۳۰

جلد ۵۷ عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ۶ روپے قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۴	جنوری سنہ ۱۹۶۲ء	جلد ۵۷

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن

اچھرہ۔ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

انگلستان کے مشہور شاعر ٹینی سن نے ایک شہرۂ آفاق نظم "دی لیڈی آف شیلاٹ" میں ایک ایسی خاتون کی داستانِ حیات قلمبند کی ہے جو ایک جزیرے میں الگ تھلگ انسانی آبادی سے بہت دُور ایک مینار میں مقیّد تھی۔ اُسے یہ حکم ملا تھا کہ وہ کبھی باہر جھانک کر حقیقت کی دنیا کو دیکھنے کی حماقت نہ کرے ورنہ اس پر ایک زبردست مصیبت نازل ہوگی۔ وہ بیچاری زندگی اور اس کی دلفریبیوں کو اُن آئینوں میں دیکھتی جو اُس کے سامنے ہر وقت آویزاں رہتے اور اس کے جو نقوش اُسے دلکش معلوم ہوتے انہیں وہ کپڑوں میں کاڑھنے کی کوشش کرتی۔

اس عذاب کو وہ بدنصیب کچھ دیر تو برداشت کرتی رہی لیکن ایک دن اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اُس نے حیاتِ انسانی کا آئینوں میں نہیں بلکہ عالمِ واقعات میں مشاہدہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اُس نے جس لمحہ حقیقت کی دنیا پر ایک نظر دوڑائی تو جو آئینے سامنے معلق تھے وہ سب چکنا چور ہو گئے اور خود اُس کی اپنی زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔

دنیا انسانی ادب کی جن مختلف اقسام سے آشنا ہے اُن میں ایک قسم یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کو حیاتِ انسانی سے سب سے زیادہ رازداں ہونا چاہیے وہ اُس سے سب سے زیادہ بے تعلق ہو جائیں۔ وہ انسانی احساسات و جذبات سے بہت دُور ایک ایسی رنگین فضا میں وقت گزارنے کے عادی بن جائیں جہاں زندگی کے حقائق انہیں اپنے اصلی رنگ و بو میں نظر نہ آنے پائیں۔ انہیں اوّل تو اپنے عیش و آرام سے فرصت نہ ملے

کہ وہ زندگی کی تلخیوں کا جائزہ لے سکیں اور اگر کبھی وہ اس کا عزم بھی کریں تو چاپلوسوں کا ایک جمِ غفیر انہیں حقیقتِ حال تک پہنچنے نہ دے۔ وہ اُن کے سامنے رنگ رنگ کے آئینے آویزاں کر دے جن میں دیکھنے سے انہیں ہر آن صرف یہی نظر آتا رہے کہ "حضور کا اقبال ترقی پر ہے، دشمن اپنی موت مر رہا ہے۔ عوام خوشحال ہیں اور ہر نفس حضور کی سلامتی اور درازیٔ عمر کے لیے دعا گو ہے۔ لوگوں کو کوئی تکلیف اور پریشانی نہیں، انہیں اگر کوئی اضطراب ہے تو صرف یہی کہ کہیں حضور خدانخواستہ رنجیدہ خاطر نہ ہوں کیونکہ اُن کی زندگیاں تو حضور کے ساتھ وابستہ ہیں۔"

چاپلوسوں اور خوشامدی لوگوں کی یہ مدح سرائی درحقیقت برسرِ اقتدار گروہ کے لیے سب سے بڑی آزمائش اور سب سے زیادہ خوفناک فتنہ ہے۔ جس طرح بدنصیب لیڈی آف شیلاٹ رنگا رنگ کے آئینوں میں گھر کر حقائق سے ناآشنا رہی بالکل اسی طرح ملک و ملت کے بااختیار لوگ تعریف و توصیف کے ان ہوائی قلعوں میں آباد ہو کر زندگی اور اُس کے اصل مسائل سے یکسر غافل ہو جاتے ہیں۔ بے جا مدح سرائی کرنے والے خود غرض لوگ انہیں اتنا موقع ہی نہیں دیتے کہ وہ حیاتِ انسانی کا صحیح طور پر مطالعہ کر سکیں۔ لوگ فاقے کرتے ہیں اور چاپلوسوں کا ہجوم انہیں یہ باور کراتا ہے کہ وہ خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ملک کا امن غارت ہوتا ہے اور عوام پستے چلے جاتے ہیں اور ہر جانب سے نالہ و فریاد کی صدائیں بلند ہوتی ہیں لیکن یہ حکمران یہی سمجھتے ہیں کہ لوگ فارغ البال ہیں۔ [illegible] اس خیال کو جھٹلانے کی کوشش کرتا ہے تو اسے جھوٹے [illegible] گروہ کی [illegible] کیا جاتا ہے جو آپ کے ملک کا حاسد [illegible] ہے [illegible] لوگ تو بڑے عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں [illegible] آپ کی خیر [illegible] ہیں۔ لوگوں کے اخلاق بگڑتے ہیں اُن کے اندر احساسِ شکست، بزدلی [illegible] جیسے تباہ کن امراض پیدا ہوتے ہیں۔ وہ بیچارے

خود غرضی، تعصب، تنگ نظری کا شکار ہوتے ہیں۔ لیکن یہ چالاک اور عیار لوگ برسراقتدار گروہ کو قوم کے اس احساس سے یکسر غافل رکھتے ہیں اور انہیں ہر طرف سے یہ یقین دلاتے ہیں کہ ملت اُن کی قیادت و سیادت میں ہر لحاظ سے قابلِ تعریف ترقی کر رہی ہے اور کسی شخص کو کسی قسم کا کوئی گلہ شکوہ نہیں۔ یہ چند مخالف آوازیں جو کبھی کبھی جناب کے کانوں میں پڑتی ہیں، وہ ایسے دشمنوں کی ہیں جو کسی صورت میں بھی آپ کے خیر خواہ نہیں ہو سکتے۔ یہ آپ کے ازلی بدخواہ ہیں جو آپ کے جاہ و مال اور عزت و وقار کو حاسدانہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اس طرح کی باتیں کرنے سے اُن کا مقصد بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ وہ آپ کی ہر آن بڑھتی ہوئی شہرت کو داغدار کریں۔ ان کی تنقید تعمیری نہیں بلکہ تخریبی ہے اور آپ کو ان کی بیہودہ باتوں پر قطعاً دھیان نہ دینا چاہیے۔

تعریف و توصیف کا یہ عظیم فتنہ اگرچہ حکمران گروہ کو مسندِ اقتدار سنبھالنے کے ساتھ ہی گھیرے میں لے لیتا ہے لیکن آغاز میں اس کے نتائج اتنے خوفناک نہیں ہوتے جتنے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برسرِاقتدار طبقہ یا شخص اول روز سے ہی زندگی کو رنگین آئینوں ہی میں سے دیکھتا ہے۔ وہ آئینے جو اس کے خوشامدی اس کے سامنے آویزاں رکھتے ہیں لیکن کچھ مدت تک جذبات و احساسات کے اعتبار سے یہ لوگ انسان ہی رہتے ہیں۔ ایک بے حس قوتِ قاہرہ میں تبدیل نہیں ہو پاتے۔ فاقہ کشی، افلاس، دکھ، بے روزگاری اور بیماری کے عملی مضمرات سے وہ بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ اُن کے سامنے جب یہ بات لائی جاتی ہے کہ ملک کے اندر اتنی تعداد میں لوگ روٹی کے لقمہ تک سے محتاج ہیں تو ان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں کرب و اضطراب کی وہی ٹیسیں اٹھتی ہیں جیسے ایک مفلوک الحال شخص اپنے بچوں کو فاقے مرتے دیکھ کر محسوس کرتا ہے۔ نہیں جب یہ کہا جاتا ہے کہ اس سرزمین میں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جن کے سامنے اُن کے عزیز و اقارب بیماری کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دیتے ہیں لیکن وہ علاج معالجہ

کے لیے ایک پائی بھی صرف نہیں کرسکتے تو اس افسوسناک اطلاع سے انہیں دلی صدمہ پہنچتا ہے وہ جب اغوا اور قتل کے روح فرسا واقعات سنتے ہیں تو ان کا خون اسی طرح کھولتا ہے جس طرح ایک صاحب دل انسان کا کھولنا چاہیے۔ سوسائٹی کے بے لگام طبقوں کی بے پردگی و تبذل کے حالات معلوم کر کے ان کے اندر نفرت و حقارت کا وہی جذبہ ابھرتا ہے جو ایک صحیح دل و دماغ رکھنے والے آدمی کو بے چین اور بیتاب کرتا ہے۔ عوامی زندگی گو ان کی نظروں سے اوجھل ہوتی ہے لیکن جذبات و احساسات سے اوجھل نہیں ہوتی۔ مشترک انسانیت کا احساس ان کے دلوں میں ارتعاش پیدا کرتا ہے اور وہ معاشرہ میں ظلم و ستم کی گرم بازاری دیکھ کر کبھی کبھی خون کے آنسو بھی بہا دیتے ہیں اور صورت حال کو بدلنے کے لیے امکانی حد تک جدوجہد کرتے ہیں

انسانی دکھ درد کا یہ احساس بڑا قابل قدر ہے اور اسے انسان کی روحانی اور اخلاقی صحت کی سب سے بڑی ضمانت کہا جا سکتا ہے لیکن ایک صاحب اقتدار کے لیے جتنا یہ احساس ضروری ہے اتنا ہی اسے مٹانے اور ختم کرنے کا التزام بھی کیا گیا ہے۔ اس مقدس جذبہ کا سب سے بڑا دشمن خود انسان کا اپنا نفس ہے۔ یہ جذبہ چونکہ انسان کے ضمیر کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اسے بیدار کرتا ہے، اس لیے نفس نے اسے سلانے کی سب سے زیادہ کوشش کی ہے تاکہ انسان کا ذہن کسی قسم کی کوئی خلش محسوس نہ کرے اور وہ بے فکر ہو کر، دنیا اور اس کی پریشانیوں سے بالکل الگ تھلگ رہ کر آرام و آسائش کی زندگی بسر کر سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انسان نے عجیب و غریب قسم کے نظریات گھڑے ہیں۔ "تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو" کا عافیت پسندانہ تصور بھی ایسی خود غرضانہ ذہنیت کی غمازی کرتا ہے۔

یہ عافیت پسندانہ طرز زندگی اپنے مزاج کے اعتبار سے یونہی بڑی جاذب نظر ہے

لیکن یہ اُن لوگوں کے لیے اپنے اندر غیر معمولی کشش کا سامان رکھتا ہے جن کے ہاتھ میں اقتدار کی وجہ سے بے پناہ قوت منتقل ہو جاتی ہے، جو پورے ملک کی دولت کے امین قرار پاتے ہیں۔ وہ حضرات جنہیں نہ صرف ذاتی نفع و نقصان، بلکہ پوری قوم کے سود و زیاں کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے اور جن سے اس بات کی بجا طور پر توقع ہو کہ وہ اُس قوم کے رکھوالے ہوں گے، اُس کے دکھوں کو اپنے دکھ سمجھیں گے اور اُس کی پریشانیوں کو ذاتی پریشانیاں خیال کریں گے۔ وہ اگر اپنے احساسات کو اس حد تک زندہ رکھیں کہ خلفائے راشدین کی طرح ہر جاندار کا دکھ درد اُن کے دلوں کے اندر ارتعاش پیدا کر دے، تو پھر وہ مسندِ اقتدار پر متمکن ہو کر دادِ عیش نہیں دے سکتے بلکہ اپنے سروں پر کانٹوں کا تاج پہنا لیتے ہیں جو انہیں ہر لمحہ بے چین رکھتا ہے جن لوگوں نے اقتدار کے تخت پر بیٹھ کر مشترک انسانیت کے احساس کو مٹنے نہیں دیا بلکہ اُس کے اندر قوت و طاقت پیدا کی ہے، انہوں نے بااختیار بن کر عیش و تنعّم کی زندگی اختیار نہیں کی بلکہ شاہی میں فقیری کا روشن اور تابناک مسلک اپنایا ہے

انسانی تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ دورِ اقتدار میں جس قوم نے مشترک انسانیت کے ان بیش قیمت احساسات کی سب سے زیادہ حفاظت و پاسبانی کی ہے وہ اُمّتِ مُسلمہ ہے۔ اسلام نے سب سے پہلے حاکم و محکوم کے درمیان اُس مصنوعی فرق کو ختم کر دیا ہے جو دنیا کے با اقتدار لوگوں نے اپنے عیش و آرام کے لیے قائم رکھا ہے۔ اسلام امیر کو غیر مسئول اقتدار عطا نہیں کرتا بلکہ اُسے اپنے ہر قول اور فعل کے لیے خدا اور خلق دونوں کے سامنے جواب دہ ٹھہراتا ہے۔ دوسرے وہ حاکم کو قانون سے بلند و بالا نہیں سمجھتا بلکہ اُسے بھی اسلامی قانون کا اسی طرح پابند قرار دیتا ہے جس طرح کہ عام لوگوں پر اُس کی اطاعت فرض ہے مسلمانوں کے اندر جب تک اسلامی ریاست کے ان دو بنیادی اصولوں کا احترام موجود رہا اُن کے حکام نے اپنے آپ کو انسان ہی سمجھا اور کبھی مافوق البشر ہونے کا دعویٰ نہ کیا۔ وہ عام انسانوں کی طرح رعایا

کے درمیان جیے، اُن کے دکھ درد میں برابر شریک ہوتے رہے، اُن کے مصائب اور تکلیفات کو اُسی شدت کے ساتھ محسوس کرتے رہے جس شدت کے ساتھ انسان اپنی پریشانیوں کو محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ اُن کے اس صحت مندانہ طرزِ عمل کی وجہ سے اُن کے اندر احساسات کی شمعیں اُسی طرح روشن رہیں جس طرح ایک حساس انسان کے اندر روشن ہوتی ہیں۔ شدتِ احساس کی وجہ سے ان کے دل غموں کے ہجوم میں گھرے رہتے ہیں لیکن انھوں نے طبیعت کی اس افسردگی کو، جو مال و متاع کی کمیابی کی وجہ سے نہیں، بلکہ دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہو کر انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے، مسرت و نشاط سے ہمیشہ عزیز تر رکھا۔

ناصبوری ہے زندگی دل کی
آہ وہ دل کہ ناصبور نہیں

دل کی یہ ناصبوری قلب و احساس کے زندہ ہونے کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ اس کی مدد سے ایک انسان دوسرے انسان کی قلبی واردات و کیفیات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، وہ اپنے دل کے ہاتھوں ہی اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ نوعِ بشری سے محبت کرنا سیکھے، اُس کے دکھوں کی چوٹ سہنے کی اپنے اندر ہمت و طاقت پیدا کرے اور پھر ان دکھوں کے مداوا کے لیے اپنی جان تک کی بازی لگا دے۔ جس دل میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے یوں سمجھیے کہ اُس نے حیاتِ انسانی کے اصل راز کو پا لیا۔ ایسا شخص بزدلوں کی طرح مسندِ اقتدار کو گوشۂ عافیت نہیں سمجھتا جس میں بیٹھ کر سکون اور آرام کے ساتھ انسانیت کی بربادیوں کا ایک غیر متعلق تماشائی کی طرح نظارہ کیا جا سکے بلکہ اُس شخص کا دلِ بیتاب اُسے اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ زندگی کے اُن متلاطم سمندروں، جہاں انسانیت کو ہر آن مصائب کے تھپیڑے لگ رہے ہیں، بے خطر کود پڑے اور زخموں سے چور انسان کو اُن سے نجات دلائے۔

یہ جذبِ اندروں کوئی شاعرانہ سوز نہیں جو انسان کو محض غم کی تصویر بنا کر رکھ دے اور اس

طرح اُس کے فکری اور عملی قویٰ کو بالکل معطل و مفلوج بنا دے۔ یہ "سوزِ دروں" فکر و عمل کا سب سے زبردست محرک ہے۔ اس سوز کے تحت افرادِ انسانیت اور اُس کے مسائل پر بڑی ہمدردی کے ساتھ غور و فکر کرتے ہیں اور پھر اپنے نتائجِ فکر سے انسانیت کو عملی اعتبار سے مالا مال بھی کرتے ہیں۔ یہ سوز اُن کے اندر ایثار، ہمدردی، بے نفسی اور بصیرت پیدا کرتا ہے۔ یہ اُن کے اندر ایک ایسے لافانی اور مقدس احساس کی پرورش کرتا ہے جو انہیں ہر لحظہ اُن کے فرائض سے آگاہ رکھتا ہے اور انہیں بتاتا ہے کہ وہ بہت تک دوسروں کی تکلیفات کو اپنی تکلیفات پر مقدم نہیں رکھتے۔ اس وقت وہ اُس فرض سے صحیح معنوں میں سبکدوش نہیں ہو سکتے جو ایک انسان کی حیثیت سے اُن پر عائد ہوتا ہے اس بنا پر یہ سوز انسان دوستی اور فرض شناسی کی سب سے مضبوط اور مستحکم بنیاد ہے۔

پھر اس احساس سے اگر ایک طرف انسان کے دل و دماغ میں وسعت پیدا ہوتی ہے تو دوسری طرف اُس کے اندر یہ جذبہ بھی نشوونما پاتا ہے کہ وہ دوسروں کی غلطیوں اور قصوروں کو فیاضی کے ساتھ جانچے اور ایک سخت گیر قاضی کی طرح ان پر حکم لگانے کی بجائے ایک اہلِ دل انسان کی طرح ان کی وجہ اور علت معلوم کرنے کی کوشش کرے یعنی اُسے چور کو پکڑنے اور سزا دینے سے کہیں زیادہ اس بات کی فکر دامنگیر ہو کہ وہ اُن اسباب کا کھوج لگائے جنہوں نے اس شخص کو سیدھے راستے سے ہٹ کر گناہ کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ یہ احساس اُن کے اندر عجز پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنی نیکی، پرہیزگاری، خدا ترسی اور قوتِ عمل کو اپنی ذاتی جدوجہد پر محمول نہیں کرتے بلکہ اُن کے سامنے تو اُن کا یہ خیال موجود رہتا ہے کہ یہ محض خداوند تعالیٰ کی عنایت اور نوازش ہے جس نے انہیں صحیح طرزِ فکر اور شریفانہ طرزِ عمل کی توفیق نصیب ہوئی، ورنہ اگر فضلِ الٰہی شاملِ حال نہ ہوتا تو کیا عجب ہے کہ وہ بھی انہی برائیوں میں ملوث ہو گئے ہوتے جن برائیوں میں ان کے بدنصیب بھائی گرفتار ہیں۔ جیسے کوئی شخص اپنے

اندر اس قسم کے احساسات و جذبات پائے جاتے ہیں تو اس کے اندر وہ مشترک انسانیت کا احساس قوت پکڑتا ہے جس کے بغیر بسا اوقات کم ظرف انسان نیکی کے غرہ میں انسانی ہمدردی اور انکسار جیسی بلند صفات کھو بیٹھتے ہیں۔

افضل البشر بعد الانبیاء حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خوف خدا، تقویٰ و طہارت کو کون نہیں جانتا لیکن اس پاکباز انسان کی دلی کیفیات کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ ایک چڑیا کو درخت پر بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس کو خطاب کر کے فرمانے لگے:

"اے چڑیا تو کس قدر خوش نصیب ہے، درختوں کے پھل کھاتی ہے اور ٹھنڈی چھاؤں میں خوش رہتی ہے۔ پھر موت کے بعد تو وہاں جائے گی جہاں تجھ سے بازپرس نہیں ہوگی۔ اے کاش ابوبکر بھی اسی قدر خوش نصیب ہوتا۔"

کبھی یہ ارشاد فرماتے:

"اے کاش میں رہگذر پر ایک درخت ہوتا، اونٹ وہاں سے گزرتا، مجھ کو پکڑتا، اپنا منہ مجھ پر مارتا، مجھ کو چباتا اور اس طرح میری تحقیر کرتا . . .

یہ سب کچھ ہوتا مگر میں بشر نہ ہوتا۔"[1]

حضرت ابوبکر صدیق کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسندِ اقتدار کی ذمہ داریوں کو کما حقہ ادا فرمایا۔ اُن کی آنکھوں سے یہ حقیقت ایک لمحہ کے لیے بھی اوجھل نہ ہونے پائی کہ یہ اقتدار عیش و آرام کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک زبردست آزمائش ہے۔ جب اُن پر حملہ کیا گیا تو لوگ اس روح فرسا خبر کو سن کر اُن کے پاس آتے۔ وہ اُن کو خراج تحسین پیش کرتے انہیں الوداع کہتے اور امیر المومنینؓ کے لقب سے مخاطب کرتے۔ اس پر انہوں نے فرمایا:

"کیا تم امارت کو میرا توشۂ آخرت بنا رہے ہو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں زندگی کا ایک دور گزارا، اور جب رفیقِ اعلیٰ

---

[1] کنز العمال بر مسند امام احمد ج ۴ ص ۳۶۱

نے انہیں اپنے پاس واپس بلا لیا تو وہ مجھ سے خوش تھے۔ اس کے بعد مجھے حضرت ابو بکر صدیق کی رفاقت کا شرف نصیب ہوا۔ آخر کار وہ بھی وفات پا گئے میں آخر دم تک اُن کا تابع فرمان رہا۔ لیکن اب تمہاری یہ امارت ہی میرے لیے خوف کا سبب بن گئی ہے جو میری تعریف و توصیف کر کے مجھے بہکانا چاہتا ہے وہ فریب خوردہ ہے۔ خدا کی قسم! میری تو یہ خواہش ہے کہ جیسا یہاں آیا تھا ویسا ہی یہاں سے چلا جاؤں۔ نہ مجھے کچھ دینا ہو نہ لینا ہو۔"

روایت ہے کہ انہوں نے ایک تنکے کی طرف ہاتھ بڑھایا جو اُن کے بستر کے قریب زمین پر پڑا تھا اور اُسے اٹھا کر اپنی آنکھوں کے سامنے لے گئے اور کہنے لگے کاش! میں یہ تنکا ہوتا، کاش میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ کاش! میری ماں مجھے نہ جنتی۔ کاش! میں کچھ بھی نہ ہوتا۔ کاش میں نسیاً منسیاً ہوتا۔

رعایا کے دکھ درد اور تکلیفات کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس قدر احساس تھا کہ وہ معمولی سے معمولی تکلیف سن کر بھی سخت بے چین ہو جاتے اور اس بات کے لیے مسلسل کوشاں رہتے کہ اُن کا یہ احساس خلافت کی ذمہ داریوں کے ساتھ بڑھتا چلا جائے۔ اسی لیے وہ عوام کے ساتھ گھل مل کر رہتے۔ اُن کے مسائل کو ایک حساس فرض شناس اور صاحب دل انسان کی طرح سمجھنے کی کوشش کی اور پھر اُن کے حل کرنے کے لیے پوری ہمت اور لیاقت کے ساتھ جدوجہد بھی کی۔ اُن کی سیاست کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ روم و شام پر فوجیں بھیج رہے ہیں، قیصر و کسریٰ کے سفیروں سے مملکتی سطح پر گفتگو فرما رہے ہیں۔ حضرت خالد بن ولیدؓ اور امیر معاویہؓ سے باز پرس کر رہے ہیں، سعد بن ابی وقاص، ابو موسیٰ اشعری، عمروؓ بن العاص کے نام اہم احکام لکھوا رہے ہیں لیکن دوسری طرف بدن پر بارہ پیوند کا کرتا پہن رکھا ہے، سر پہ پھٹا سا عمامہ ہے، پاؤں میں پھٹی ہوئی جوتیاں ہیں

پھر اس حالت میں یا تو کاندھے پر مشک ہے کہ بیوہ عورتوں کے گھر پانی پہنچا دیں یا مسجد کے کسی کونے میں فرشِ خاک پر لیٹے ہوئے آرام فرما رہے ہیں۔

ایک دفعہ خطبہ میں کہا کہ صاحبو! ایک زمانہ میں میں اس قدر نادار تھا کہ لوگوں کو پانی بھر کر لا دیا کرتا تھا اور وہ میری اس محنت کے صلے میں مجھے خشک کھجوریں دیا کرتے تھے اور اسی پر میں بسر اوقات کرتا۔ یہ کہہ کر منبر سے اتر آئے۔ لوگوں کو تعجب تھا کہ یہ منبر پر کہنے کی کیا بات تھی۔ فرمایا کہ میری طبیعت میں ذرا غرور آ گیا تھا یہ اس کی دوا تھی۔

۱۸ھ میں قحط پڑا۔ اس وقت حضرت عمرؓ کی بیقراری قابلِ دید تھی۔ قیادت اور سیادت کی پوری تاریخ میں اس کی نظیر ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ خلیفہ ثانی نے گوشت، گھی اور تمام دوسری مرغوب غذائیں ترک فرما دیں۔ ایک دن اپنے بیٹے کے ہاتھ میں خربوزہ دیکھا تو سخت خفا ہوئے۔ فرمانے لگے "مسلمان بھوک کے مر رہے ہیں اور تم میوے کھاتے ہو۔"

گھی کی بجائے زیتون کا استعمال شروع کر دیا اور اس کے مسلسل استعمال سے ایک روز شکمِ مبارک میں درد ہونے لگا۔ آپ نے پیٹ میں انگلی چبھو کر فرمایا "جب تک ملک میں قحط ہے یہی کچھ ملے گا۔"

عکرمہ بن خالد کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے ایک وفد نے مل کر عرض کیا کہ آنجناب ذرا بہتر کھانا کھایا کریں تو اللہ تعالیٰ کے کام کرنے کے لیے آپ کے اندر زیادہ قوت و توانائی پیدا ہو جائے گی۔ آپ نے دریافت فرمایا: کیا یہ تمہاری ذاتی رائے ہے یا سب مسلمان اس کا تقاضا کرتے ہیں۔ عرض کیا گیا، یہ سب مسلمانوں کے دل کی آواز ہے۔ فرمایا: میں تمہاری خیرخواہی کے لیے ممنون ہوں مگر میں اپنے پیش روؤں کی شاہراہ ترک نہیں کر سکتا۔ مجھے ان کی ہمنشینی یہاں کی لذتوں سے مرغوب ہے۔"

جو لوگ محاذِ جنگ پر ہوتے آپ ان کے گھروں میں تشریف لے جاتے اور عورتوں سے پوچھ کر انہیں بازار سے سودا سلف خرید کر لا دیتے۔ اہلِ فوج کے خطوط آتے تو خود

گھروں میں پھر کر پہنچاتے۔ جس گھر میں کوئی پڑھا لکھا نہ ہوتا وہاں خود ہی چوکھٹ پر بیٹھ جاتے اور گھر والے جو کچھ لکھاتے لکھ دیتے۔

خلافت کی ذمہ داریوں کے بارے میں ان کے احساسات جس قدر نازک تھے اُن کا اندازہ اُن الفاظ سے کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے وفات کے وقت ارشاد فرمائے۔

حضرت عمرؓ اپنے لختِ جگر حضرت عبداللہؓ کو اپنی تجہیز و تکفین کے متعلق وصیت فرما رہے تھے کہ اُن کے جنازے کے ساتھ عورتیں نہ چلیں، اور اُن کی تعریف میں وہ باتیں نہ کہی جائیں جو اُن میں نہیں ہیں۔ اس لیے کہ اللہ انہیں زیادہ جانتا ہے۔ ابھی آپ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکل ہی رہے تھے کہ آپ نے محسوس کیا کہ اب لقائے ربانی کا وقت بالکل قریب آگیا ہے۔ اس حالت میں بیٹے سے فرمایا: میرا رخسار زمین پر رکھ دو! حضرت عبداللہ نے آبدیدہ ہو کر کہا: ابا! کیا میرے زانو اور زمین میں کوئی فرق ہے؟ فرمایا "تیری ماں نہ رہے میرا رخسار زمین پر رکھ دو"، جب بیٹے نے باپ کا رخسار زمین پر ٹکا دیا تو اپنے دونوں پاؤں ملاتے اور فرمانے لگے، افسوس ہے مجھ پر اور میری ماں پر! اگر مجھے اللہ نے معاف نہ کیا" وہ یہی فقرہ بار بار دہراتے رہے تاآنکہ روح نے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا۔

یہ سب واقعات جن کی حیثیت مشتے نمونہ از خروارے کی سی ہے اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ ایک حساس اور فرض شناس انسان خلافت کی ذمہ داریوں کو کس طرح محسوس کرتا ہے اور پھر ان سے کس اخلاص کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ حضور سرورِ کائنات نے اس سلسلہ میں ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

من ولي من امر المسلمين	جس شخص کو مسلمانوں کی زمام کار سونپی گئی اور
شيئًا ثم لم يحطهم بنصحه كما يحوط	اُس نے اس فرض کو اُس جذبۂ خیرخواہی سے

اهل بیتہٖ فلیتبوأ مقعدہ من النّاس۔ سرانجام دینے میں کوتاہی کی جس سے کہ وہ اہل خانہ کے معاملات انجام دیتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنالے۔

اس حکیمانہ قول میں رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک امیر کی ذمہ داریوں کو بڑی عمدگی سے بیان فرمایا ہے۔ انسان کی سرشت میں یہ چیز داخل ہے کہ وہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی دقتوں اور پریشانیوں کو سب سے زیادہ جانتا ہے اور انہیں بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ حضورؐ نے اس سلسلہ میں امیر کو یہ بات ذہن نشین کرائی ہے کہ "من و تو" کی تفریق کی وجہ سے انسانی احساسات میں جو فرق واقع ہو جاتا ہے اُس سے امیر کو حتی الامکان بالا ہونا چاہیے اور اُسے لوگوں کے معاملات کو اُسی دلسوزی، دلچسپی اور توجہ سے حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جس سے وہ اپنے ذاتی معاملات حل کرتا ہے۔ دوسرے اس ارشاد کے اندر اُس تعلقِ خاطر کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے جو اسلام خلیفہ اور رعایا کے درمیان قائم کرنا چاہتا ہے جس طرح باپ اور بیٹے کے درمیان، اور میاں اور بیوی کے درمیان تعلقات ہر قسم کے تکلفات سے پاک ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح خلیفہ کا اپنی رعایا کے ساتھ تعلق بھی ہر قسم کی بناوٹ سے پاک ہونا چاہیے۔ حاکم اور محکوم کے درمیان جو مصنوعی حجابات حائل ہیں وہ اسلام کی نظر میں سخت ناپسندیدہ ہیں۔ خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ باپ کی طرح اپنی اولاد یعنی رعایا کی مشکلات کو اچھی طرح جاننے کی کوشش کرے اور پھر باپ کی سی تڑپ اور بیقراری کے ساتھ انہیں دور کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ راعی اور رعیت کے درمیان بُعد اور دُوری کا جو تصور دنیا میں موجود ہے وہ شیطان کے دماغ کی کرشمہ سازی ہے۔ حضور سرورِ کائنات اور اُن کے جلیل القدر خلفاءؓ نے اپنے طرزِ عمل سے اسے دنیا سے نیست و نابود کر کے رکھ دیا۔ خلفائے راشدین عام لوگوں کی طرح ایک سیدھی سادھی، ہر قسم کے تکلفات سے پاک زندگی بسر کرتے، لوگوں سے محبت کے ساتھ ملتے، اُن کے مسائل سمجھتے اور پھر

انہیں حل کرنے۔ اُن کے ہاں کوئی چوبدار نہ تھے جو اُن کی تشریف آوری کے وقت ہٹو بچو کی آوازیں لگاتے۔ ان کی زندگی میں انتہائی بے ساختہ پن تھا حضرت عمرؓ کا یہ معمول تھا کہ وہ ہر نماز جمعہ کے بعد صحن مسجد میں بیٹھ جاتے اور جس کو جو کچھ اُن سے کہنا اور سننا ہوتا بلا تکلف کہتا۔ کوئی نہ ہوتا تو تھوڑی دیر انتظار کر کے تشریف لے جاتے۔ نہ ہی رعایا سپاسناموں اور پُرتکلف دعوتوں میں اُن کے قیمتی اوقات کو ضائع کرتی اور نہ ہی وہ رعایا کے معاملات کو دفتری پیچیدگیوں میں اُلجھا کر اُس کی پریشانی کا باعث تھے۔ امور سلطنت محبت، تدبر اور بے تکلفی کی اُسی فضا میں طے ہوتے جس میں کہ ایک خاندان کے معاملات طے کیے جاتے ہیں۔

رعایا سے الگ تھلگ رہنے کا رجحان، اور اس کے معاملات کو لیڈی آف شیلاٹ کی طرح مصاحبین کے فراہم کردہ آئینوں میں دیکھنے کی عادت اور پھر عوام کے ساتھ تمرد و استکبار کا رویہ یہ سب چیزیں اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی ہیں۔ انسان کے اندر سے جو جذبہ ان کی آبیاری کرتا ہے اُس کا خمیر خود غرضی، انانیت اور ہوس کاری سے اٹھایا گیا ہے اور فریب خوردہ عقل نے ان غلط اور گمراہ کُن افکار و اعمال کے جواز کے لیے بھی بعض بڑے عجیب و غریب نظریات گھڑ لیے ہیں۔ یونانی ادب میں دیوتاؤں کا جو تصور موجود ہے وہ یہ ہے کہ ایک مافوق البشر مخلوق انسانی آبادی سے بہت دور اُونچے پہاڑوں پر عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ انسانوں کی حیثیت اُس کے نزدیک محض کھلونوں کی سی ہے۔ دیوتا جب ترنگ میں آتے ہیں تو انسانی آبادیوں پر بلا تکلف بجلیاں گراتے ہیں جن سے لاکھوں انسان نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ کبھی وہ انسانوں کے درمیان جنگ و جدال اور قتل و غارت شروع کرا دیتے ہیں اور کبھی سمندروں میں جہازوں کے ڈوبنے کا سامان کرتے ہیں۔ انسان جب ان مصائب سے گھبرا کر چیختے اور چلاتے ہیں تو دیوتا اُن کی اس آہ و فغاں میں چنگ و رباب کی سی لذت محسوس کرتے ہیں۔ وہ انسانی نالوں پر تھرکتے اور ناچتے ہیں۔

مغربی اقوام نے اپنے ملکی انتظامات میں تو اس تصور سے کوئی خاص فائدہ نہ اٹھایا البتہ جب وہ استعماری عزائم کے ساتھ مشرقی ممالک کو تاخت و تاراج کرنے کے لیے نکلیں تو پھر جن لوگوں کو ان بدنصیب ممالک کی زمام کار سونپی گئی انہیں یونانی دیوتاؤں کی سی زندگی بسر کرنے کی تلقین کی۔ ہمارے ہاں سول سروس میں جن انگریزوں کو بھیجا جاتا رہا ہے وہ اپنے مزاج اور احساسات کے اعتبار سے بالکل بے حس لوگ تھے اور اسی بے حسی کو ان کی استعداد کار کا سب سے بڑا معیار ٹھیرایا گیا۔ ملک میں سے بڑی تگ و دو کے ساتھ وہ لوگ منتخب کیے گئے جن کے دل مشرقی اقوام کے خلاف پہلے ہی حقارت کے جذبات سے لبریز تھے اور پھر انہیں باقاعدہ تربیت کے ذریعہ ظالم اور سفاک بنانے کی کوشش کی گئی اور اس امر کا پورا التزام کیا گیا کہ اگر کسی انگریز کے پہلو میں اس ریاضت کے بعد بھی احساس کی کوئی رمق باقی رہ گئی ہے تو اسے مشرق میں قدم نہ رکھنے دیا جائے کیونکہ استعمار پسند اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ مشترک انسانیت کا احساس بیدار ہونے کے بعد کوئی صاحب دل شخص وہ مظالم نہیں ڈھا سکتا جو مشرقی اقوام پر ڈھانے مقصود تھے

مغرب کے بعض مفکرین نے اس غیر انسانی اور ظالمانہ طرز عمل کے لیے کچھ دلائل بھی فراہم کیے ہیں۔ ان میں ایک دلیل یہ ہے کہ ایک صاحب اقتدار انسانی احساسات و جذبات سے جس قدر عاری ہوگا اتنے ہی اس کے فیصلے محکم اور بے لاگ ہوں گے۔ یہ بات بظاہر بڑی معقول معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں جذبات و احساسات کے عمل دخل کو نہایت ہی غلط رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک با اختیار آدمی کو کسی وقتی تاثر سے اس قدر مغلوب نہ ہونا چاہیے کہ اس کی فکری اور عملی صلاحیتیں بالکل ٹھٹھر کر رہ جائیں لیکن وہ جب تک بے اختیار اور بے زبان لوگوں کی مشکلات کو دل کی گہرائیوں سے محسوس نہیں کرتا وہ کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھا سکتا۔ جذبہ و احساس کے بغیر وہ جو قدم بھی اٹھائے گا وہ

میکانکی نقطۂ نظر سے تو بالکل صحیح ہوگا لیکن انسانیت کے زاویۂ نگاہ سے اُس کی صحت ہمیشہ محلِ نظر رہے گی۔ انسانی آبادیوں کو کبھی علمِ طبعیات اور علمِ کیمیا کی تجربہ گاہوں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ انسان وہاں ہر قسم کے احساسات سے عاری ہوکر بے جان چیزوں کے بارے میں تلاش و جستجو کرتا رہے۔ انسان جب عقل و احساس کا مجموعہ ہے تو لازمی طور پر اس کے متعلق فیصلہ کرنے میں بھی دونوں کا عمل دخل ضروری ہے۔ اس بنا پر ایک حاکم کا فرض ہے کہ وہ صاحبِ دل انسان کی طرح رعایا کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرے اور پھر مشین کی سی بے حسی کے ساتھ نہیں، بلکہ ایک حساس اور فرض شناس انسان کی سی ہمدردی اور ذہانت کے ساتھ اُس پر حکم لگائے۔ نضیر نامی ایک شخص تھا جو حضور سرورِ کائنات اور مسلمانوں کو سخت ایذا دیا کرتا تھا۔ فتح مکہ کے بعد جب حضور شہر میں داخل ہوئے تو ایک مجمع عام میں آپ نے حضرت علی مرتضیٰ کو حکم دیا کہ اس بدبخت کی گردن اُڑا دو۔ ذوالفقار حیدری نے ایک آن میں اُس کم بخت کا خاتمہ کر دیا۔ نضیر کی لاش خاک و خون میں تڑپ رہی تھی لیکن وہ ہستی جس کی آنکھوں میں دوشیزہ لڑکیوں سے بھی زیادہ حیا تھی جس کا قلب تاثراتِ لطیفہ کا سرچشمہ تھا۔ اس دردانگیز منظر سے مطلق متاثر نہ ہوئی۔ نضیر کی بیٹی نے باپ کے قتل کی خبر سنی تو نوحہ و فریاد کرتی اور باپ کی جدائی میں درد انگیز اشعار پڑھتی ہوئی دربارِ نبوی میں حاضر ہوئی۔ اللہ اکبر! اشعار سنے تو اس قدر متاثر ہوئے کہ اس لڑکی کے ساتھ مل کر رونے لگے۔ یہاں تک کہ جوشِ ہمدردی نے اُس سب سے زیادہ ضبط کرنے والے انسان کے سینے سے ایک آہِ سرد نکلوا کر چھوڑی۔ پھر نضیر کی تڑپتی ہوئی لاش کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: "یہ فعل محمد رسول اللہ کا ہے" اور اپنی اشکبار آنکھ پر انگلی رکھ کر کہا "یہ فعل محمد بن عبداللہ کا ہے" پھر حکم دیا کہ نضیر کے بعد کوئی شخص مکہ میں قتل نہ کیا جائے گا۔[۱]

یہ ہے وہ طریق جس سے احساسِ فرض اور مشترک انسانیت کے احساس کو نہ صرف ایک دل میں جمع کیا جاسکتا ہے بلکہ ان کے درمیان صحیح طور پر توازن بھی قائم رکھا جاسکتا

[۱] مکاتیبِ اقبال

ایک حاکم جب تک شبنم کی لطافت کے ساتھ سورج کی حرارت اور شیشہ کی نزاکت کے ساتھ پتھر کی سختی اپنے اندر پیدا نہیں کرتا وہ کبھی بھی اپنے فرائض کی بجا آوری میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک حاکم کو صاحبِ دل اور صاحبِ احساس ہونا چاہیے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ رعایا کے اخلاقی عیوب اور برائیوں کے ساتھ بھی سمجھوتہ کرنے کو تیار ہو جائے اور جرم اور گناہ کے ساتھ رواداری برتے۔ نہیں اسے جرم اور مجرم میں، گناہ اور گناہ کرنے والے میں تمیز کرنی چاہیے۔ ایک بااختیار انسان کی حیثیت سے اُس کا فرض ہے کہ وہ جرم کے تدارک کی پوری کوشش کرے اور اس کے استیصال کے لیے اپنی ساری قوتیں صرف کر دے لیکن بحیثیت ایک انسان اسے مجرموں کے ساتھ ہمدردی اور محبت رکھنی چاہیے۔ احساسِ فرض اور انسانی ہمدردی کے مابین صحیح توازن خدا پر پختہ یقین و ایمان اور اُس کی مخلوق کے ساتھ لازوال محبت ہی سے پیدا ہوتا ہے اور اس کی پرورش مسلمان کے دل کے علاوہ اور کہیں نہیں ہو سکتی۔

وہ لوگ جو حصولِ اقتدار کو ذاتی عیش و آرام کا ذریعہ سمجھتے ہوں اُن کے لیے اس سے بڑی مصیبت اور کوئی نہیں کہ وہ لوگوں میں گھوم پھر کر نہ صرف اُن کی تکلیفات کے متعلق صحیح قسم کی اطلاعات حاصل کریں بلکہ اُن کی شدت کو ایک اہلِ دل انسان کی طرح محسوس بھی کریں۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلموں کے ہاں کسی بلند و بالا شخصیت کا تصور ہمیشہ یہی رہا ہے کہ وہ عام لوگوں سے الگ کوئی آسمانی مخلوق ہے۔ کفارِ مکہ نے حضور سرورِ عالم کی حیاتِ طیبہ کے متعلق جو مختلف قسم کے اعتراضات کیے اُن میں ایک اعتراض یہ تھا کہ یہ عجیب پیغمبر ہے جو عام لوگوں کی طرح کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں اپنی ضرورت کی چیزیں حاصل کرنے کے لیے بڑی بے تکلفی کے ساتھ چلتا پھرتا بھی ہے۔ زندگی کا یہ فطری انداز اُن لوگوں کے لیے حیران کن تھا جن کی نظریں ہر قیصر و کسریٰ کے شاہانہ ٹھاٹھ دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ اُن کے

ذہن اس بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوتے کہ کوئی شخص مقدس رسول بھی ہو اور وہ عام لوگوں کے ساتھ مِل جُل کر زندگی بھی بسر کرے۔

حضور سرورِ کائنات اور اُن کے جلیل القدر رفقاء کار نے اپنے طرزِ عمل سے اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ حقیقی عظمت کا راز لوگوں سے الگ تھلگ رہنے میں مضمر نہیں بلکہ اُن کے ساتھ ملنے جُلنے، ان کے دُکھ درد میں شریک ہونے اور پھر ان کا مداوا کرنے میں مضمر ہے۔ عظیم لوگ نہ تو نمود و نمائش سے اپنی شخصیت کا رعب لوگوں کے دلوں میں بٹھاتے ہیں اور نہ ہی انتخاب کے امیدواروں کی طرح مصنوعی اور جھوٹے انکسار سے کام لیکر اُن کے دلوں کو مفتوح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بلا شبہ عوام میں زندگی بسر کرتے ہیں لیکن سیرت و کردار کی رفعتوں سے نیچے اتر کر عوامی سطح پر نہیں آجاتے، بلکہ دوسروں کو اپنی سطح تک بلند کرنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں کیونکہ ان کی انسانیت کے ساتھ محبت مصلحتِ وقت پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ ان کے مقدس جذبات اور فطری احساسات کا اظہار ہوتی ہے۔ بڑا انسان ہو کر ایک عام انسان کی طرح زندگی بسر کرنا اور عوام کے دلوں کی دھڑکنوں کو اپنے کانوں سے سننا اور پھر محسوس کرنا بہت مشکل کام ہے اور یہ کام وہی سرانجام دے سکتا ہے جو صحیح معنوں میں ایک عظیم اور غیر معمولی شخصیت کا مالک ہو۔ ایسے شخص کو اپنی عظمت کا لوہا منوانے کے لیے نہ تو خسروانہ جلال کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی غیر مسئول اقتدار کی۔ وہ نہ ہی سپاس ناموں کا محتاج ہوتا ہے اور نہ ہی اپنی تصاویر کی نمائش کا۔ لوگوں کے دل ان تدبیروں کے اختیار کیے بغیر ہی اُس کے احترام سے معمور ہوتے ہیں۔ اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے ایک موقع پر خلیفۂ ثانیؓ نے ایک بڑی حکیمانہ بات ارشاد فرمائی:

رجلٌ اذا کان امیرھم کانہ رجلٌ منھم واذا لم یکن امیرھم کانہ امیرھم۔

مجھ کو امارت کے لیے ایسا شخص درکار ہے کہ جب مسلمانوں کا امیر ہو تو ایسا معلوم ہو کہ گویا وہ انہی میں کا ایک ہے لیکن جب امیر نہ ہو تو (اپنے کمالات و اوصاف کی وجہ سے) اُن لوگوں کا امیر ہی معلوم ہوتا ہو۔

تفہیم القرآن

الاحزاب

(۴)

بالیقین[۵۳] جو مرد اور جو عورتیں مسلم ہیں[۵۴]، مومن ہیں[۵۵]، مطیع فرمان ہیں[۵۶]، راستباز ہیں[۵۷]

۵۳۔ پچھلے پیراگراف کے بعد متصلاً یہ مضمون ارشاد فرما کر ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف کر دیا گیا ہے کہ اوپر ازواجِ مطہرات کو جو ہدایات دی گئی ہیں وہ ان کے لیے خاص نہیں ہیں بلکہ مسلم معاشرے کو بالعموم اپنے کردار کی اصلاح انہی ہدایات کے مطابق کرنی چاہیے۔

۵۴۔ یعنی جنہوں نے اسلام کو اپنے لیے ضابطۂ حیات کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے اور یہ طے کر لیا ہے کہ اب وہ اسی کی پیروی میں زندگی بسر کریں گے۔ دوسرے الفاظ میں جن کے اندر اسلام کے دیئے ہوئے طریقِ فکر اور طرزِ زندگی کے خلاف کسی قسم کی مزاحمت باقی نہیں رہی ہے۔ بلکہ وہ اس کی اطاعت اور اتباع کی راہ اختیار کر چکے ہیں۔

۵۵۔ یعنی جن کی یہ اطاعت محض ظاہری نہیں ہے، بادلِ ناخواستہ نہیں ہے، بلکہ دل سے وہ اسلام ہی کی رہنمائی کو حق مانتے ہیں۔ ان کا ایمان یہی ہے کہ فکر و عمل کا جو راستہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھایا ہے وہی سیدھا اور صحیح راستہ ہے اور اسی کی پیروی میں ہماری فلاح ہے جس چیز کو اللہ اور اس کے رسول نے غلط کہہ دیا ہے ان کی اپنی رائے بھی یہی ہے کہ وہ یقیناً غلط ہے، اور جسے اللہ اور اس کے رسول نے حق کہہ دیا ہے ان کا اپنا دل و دماغ بھی اسے برحق ہی یقین کرتا ہے۔ ان کے نفس اور ذہن کی حالت یہ نہیں ہے کہ قرآن اور سنت سے جو حکم ثابت ہو اُسے وہ نامناسب سمجھتے ہوں اور اس فکر میں غلطاں و پیچاں رہیں کہ کسی طرح اسے بدل کر اپنی رائے

صابر ہیں[۵۸]، اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں[۵۹]، صدقہ دینے والے ہیں[۶۰]، روزہ رکھنے

کے مطابق، یا دنیا کے چلتے ہوتے طریقوں کے مطابق ڈھال بھی دیا جائے اور یہ الزام بھی اپنے سر نہ لیا جائے کہ ہم نے حکمِ خدا اور رسول میں ترمیم کر ڈالی ہے۔ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کی صحیح کیفیت کو یوں بیان فرماتے ہیں:

ذاق طعم الایمان من رضی اللہ ربًا وبالاسلام دینًا وبمحمدٍ رسولًا۔ (مسلم)

ایمان کا لذت شناس ہو گیا وہ شخص جو راضی ہوا اس بات پر کہ اللہ ہی اس کا رب ہو اور اسلام ہی اس کا دین ہو اور محمدؐ ہی اس کے رسول ہوں۔

اور ایک دوسری حدیث میں آپ اس کی تشریح یوں کرتے ہیں:

لا یؤمن احدکم حتی یکون ھواہ تبعًا لما جئت بہ (شرح السنہ)

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی خواہشِ نفس اُس چیز کی تابع نہ ہو جائے جسے میں لایا ہوں۔

۵۶ یعنی وہ محض مان کر رہ جانے والے بھی نہیں ہیں بلکہ عملاً اطاعت کرنے والے ہیں۔ ان کی یہ حالت نہیں ہے کہ ایمانداری کے ساتھ حق تو اُسی چیز کو مانیں جس کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے مگر عملاً اس کی خلاف ورزی کریں، اور اپنی مخلصانہ رائے میں تو ان سب کاموں کو بُرا ہی سمجھتے رہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا ہے مگر اپنی عملی زندگی میں ارتکاب انہی کا کرتے چلے جائیں۔

۵۷ یعنی اپنی گفتار میں بھی سچے ہیں اور اپنے معاملات میں بھی کھرے ہیں۔ جھوٹ، فریب، بدنیتی، دغابازی اور چھل بٹے اُن کی زندگی میں نہیں پائے جاتے۔ ان کی زبان وہی بولتی ہے جسے اُن کا ضمیر صحیح جانتا ہے۔ وہ کام وہی کرتے ہیں جو ایمانداری کے ساتھ ان کے نزدیک راستی و صداقت کے مطابق ہوتا ہے۔ اور جس سے بھی وہ کوئی معاملہ کرتے ہیں دیانت کے ساتھ کرتے ہیں۔

۵۸ یعنی خدا اور رسول کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلنے اور خدا کے دین کو قائم

والے ہیں[۶۱]، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں[۶۲]، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے

کرنے میں جو مشکلات بھی پیش آئیں، جو خطرات بھی درپیش ہوں، جو تکلیفیں بھی اٹھانی پڑیں اور جن نقصانات سے بھی دوچار ہونا پڑے، ان کا پوری ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔ کوئی خوف، کوئی لالچ اور خواہشاتِ نفس کا کوئی تقاضا ان کو سیدھی راہ سے ہٹا دینے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

۵۹ یعنی وہ تکبّر اور استکبار اور غرورِ نفس سے خالی ہیں۔ وہ اِس حقیقت کا پورا شعور واحساس رکھتے ہیں کہ ہم بندے ہیں اور بندگی سے بالاتر ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس لیے ان کے دل اور جسم دونوں ہی اللہ کے آگے جھکے رہتے ہیں۔ ان پر خدا کا خوف غالب رہتا ہے۔ ان سے کبھی وہ رویّہ ظاہر نہیں ہوتا جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا اور خدا سے بے خوف لوگوں سے ظاہر ہوا کرتا ہے۔ ترتیبِ کلام کو ملحوظ رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اِس عام خداترسانہ رویّہ کے ساتھ خاص طور پر "خشوع" سے مراد نماز ہے، کیونکہ اس کے بعد ہی صدقے اور روزے کا ذکر کیا گیا ہے۔

۶۰ اس سے مراد صرف فرض زکوٰۃ ادا کرنا ہی نہیں ہے، بلکہ عام خیرات بھی اس میں شامل ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں کھلے دل سے اپنے مال صرف کرتے ہیں۔ اللہ کے بندوں کی مدد کرنے میں اپنی حدِ استطاعت تک وہ کوئی دریغ نہیں کرتے۔ کوئی یتیم، کوئی بیمار، کوئی مصیبت زدہ، کوئی ضعیف و معذور، کوئی غریب و محتاج آدمی اُن کی بستیوں میں دستگیری سے محروم نہیں رہتا۔ اور اللہ کے دین کو سربلند کرنے کے لیے ضرورت پیش آجائے تو اس پر اپنے مال لٹا دینے میں وہ کبھی بخل سے کام نہیں لیتے۔

۶۱ اس میں فرض اور نفل دونوں قسم کے روزے شامل ہیں۔

۶۲ اس میں دو مفہوم شامل ہیں۔ ایک یہ کہ وہ زنا سے پرہیز کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ برہنگی و عریانی سے اجتناب کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ برہنگی و

والے ہیں،۶۳ اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔۶۴

۶۳ عریانی صرف اسی چیز کا نام نہیں ہے کہ آدمی لباس کے بغیر بالکل ننگا ہو جائے۔ بلکہ ایسا لباس پہننا بھی برہنگی ہی ہے جو اتنا رقیق ہو کہ جسم اس میں سے جھلکتا ہو، یا اتنا چست ہو کہ جسم کی ساخت اور اس کے نشیب و فراز سب اس میں سے نمایاں نظر آتے ہوں۔

۶۴ اللہ کو کثرت سے یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی زبان پر ہر وقت زندگی کے ہر معاملے میں کسی نہ کسی طرح خدا کا نام آتا رہے۔ یہ کیفیت آدمی پر اس وقت تک طاری نہیں ہوتی جب تک اس کے دل میں خدا کا خیال بس کر نہ رہ گیا ہو۔ انسان کے شعور سے گزر کر اس کے تحت الشعور اور لاشعور تک میں جب یہ خیال گہرا اتر جاتا ہے تب ہی اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کام اور جو بات بھی وہ کرے گا اس میں خدا کا نام ضرور آئے گا۔ کھائے گا تو بسم اللہ کہہ کر کھائے گا۔ فارغ ہوگا تو الحمد للہ کہے گا۔ سوئے گا تو اللہ کو یاد کر کے اور اٹھے گا تو اللہ ہی کا نام لیتے ہوئے۔ بات چیت میں بار بار اس کی زبان سے بسم اللہ، الحمد للہ، انشاء اللہ، ماشاء اللہ اور اسی طرح کے دوسرے کلمات نکلتے رہیں گے۔ اپنے ہر معاملے میں اللہ سے مدد مانگے گا۔ ہر نعمت ملنے پر اس کا شکر ادا کرے گا۔ ہر آفت آنے پر اس کی رحمت کا طلب گار ہوگا۔ ہر مشکل میں اس سے رجوع کرے گا۔ ہر برائی کا موقع سامنے آنے پر اس سے ڈرے گا۔ ہر قصور سرزد ہو جانے پر اس سے معافی چاہے گا۔ ہر حاجت پیش آنے پر اس سے دعا مانگے گا۔ غرض اٹھتے بیٹھتے اور دنیا کے سارے کام کاج کرتے ہوئے اس کا وظیفہ خدا ہی کا ذکر ہوگا۔ یہ چیز درحقیقت اسلامی زندگی کی جان ہے۔ دوسری جتنی بھی عبادات ہیں ان کے لیے بہرحال کوئی وقت ہوتا ہے جب وہ ادا کی جاتی ہیں اور انہیں ادا کر چکنے کے بعد آدمی فارغ ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ وہ عبادت ہے جو ہر وقت جاری رہتی ہے اور یہی انسان کی زندگی کا مستقل رشتہ اللہ اور اس کی بندگی کے ساتھ جوڑے رکھتی ہے۔ خود عبادات اور تمام دینی کاموں میں بھی جان اسی چیز سے پڑتی ہے کہ آدمی کا دل محض ان خاص اعمال کے وقت ہی نہیں بلکہ ہمہ وقت خدا کی طرف راغب اور اس کی زبان دائماً اس کے ذکر سے تر رہے۔ یہ

حالت انسان کی ہو تو اس کی زندگی میں عبادات اور دینی کام ٹھیک اُسی طرح پروان چڑھتے اور نشو و نما پاتے ہیں جس طرح ایک پودا ٹھیک اپنے مزاج کے مطابق آب و ہوا میں لگا ہُوا ہو۔ اس کے برعکس جو زندگی اس دائمی ذکرِ خدا سے خالی ہو اس میں محض مخصوص اوقات میں یا مخصوص مواقع پر ادا کی جانے والی عبادات اور دینی خدمات کی مثال اس پودے کی سی ہے جو اپنے مزاج سے مختلف آب و ہوا میں لگا یا گیا ہو اور محض باغبان کی خاص خبر گیری کی وجہ سے پل رہا ہو۔ اسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث میں یوں واضح فرماتے ہیں :

عن معاذ بن انس الجهنی عن رسول الله صلی الله علیه وسلم ان رجلاً سأله ایُّ المجاهدین اعظمُ اجراً یا رسولَ الله؟ قال اکثرهم لله تعالیٰ ذکراً۔ قال ایُّ الصائمین اکثر اجراً؟ قال اکثرهم لله عزّ و جلّ ذکراً۔ ثمّ ذکر الصلوٰةَ والزکوٰةَ و الحجّ والصّدقة کل ذالك یقول رسول الله صلی الله علیه وسلم اکثرهم لله ذکراً (مسند احمد)

مُعاذ بن انس جُہنی روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ جہاد کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر اجر پانے والا کون ہے؟ فرمایا جو اُن میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ یاد کرنے والا ہے۔ اس نے عرض کیا روزہ رکھنے والوں میں سب سے زیادہ اجر کون پائیگا؟ فرمایا جو ان میں سب سے زیادہ اللہ کو یاد کرنے والا ہو۔ پھر اس شخص نے اسی طرح نماز، زکوٰة، حج اور صدقہ ادا کرنے والوں کے متعلق پوچھا اور حضورؐ نے ہر ایک کا یہی جواب دیا کہ "جو اللہ کو سب سے زیادہ یاد کرنے والا ہے"

۶۳ے اس آیت میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اصل قدر و قیمت کن اوصاف کی ہے۔ یہ اسلام کی بنیادی قدریں (BASIC VALUES) ہیں جنہیں ایک فقرے کے اندر سمیٹ دیا گیا ہے۔ ان قدروں کے لحاظ سے مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ عمل کے لحاظ سے تو بلاشبہ دونوں صنفوں کا دائرہ کار الگ ہے۔ مردوں کو زندگی کے کچھ شعبوں میں کام کرنا ہے اور عورتوں کو کچھ اور شعبوں میں۔ لیکن اگر یہ اوصاف دونوں میں یکساں موجود ہوں تو اللہ تعالیٰ کے ہاں

کسی ؁۶۵ مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے اُس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔ ؁۶۶

دونوں کا مرتبہ یکساں اور دونوں کا اجر برابر ہوگا۔ اس لحاظ سے ان کے مرتبے اور اجر میں کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ ایک نے چولھا چکی سنبھالا اور دوسرے نے خلافت کی مسند پر بیٹھ کر احکام شریعت جاری کیے، ایک نے گھر میں بچے پالے اور دوسرے نے میدانِ جنگ میں اللہ اور اس کے دین کے لیے جان لڑائی۔

؁۶۵ یہاں سے وہ آیات شروع ہوتی ہیں جو حضرت زینبؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کے سلسلے میں نازل ہوئی تھیں۔

؁۶۶ ابن عباس، مجاہد، قتادہ، عِکرِمہ اور مُقاتل بن حیان کہتے ہیں کہ یہ آیت اُس وقت نازل ہوئی تھی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ کے لیے حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کا پیغام دیا تھا اور حضرت زینبؓ اور ان کے رشتہ داروں نے اسے نامنظور کر دیا تھا۔ ابن عباس کی روایت ہے کہ جب حضورؐ نے یہ پیغام دیا تو حضرت زینبؓ نے کہا انا خیر منہ نسبًا "میں اُس سے نسب میں بہتر ہوں"۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ انہوں نے جواب میں یہ بھی کہا تھا کہ لا ارضاہ لنفسی و انا ایم قریشٍ "میں اسے اپنے لیے پسند نہیں کرتی، میں قریش کی شریف زادی ہوں"۔ اسی طرح کا اظہارِ ناراضامندی اُن کے بھائی عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے بھی کیا تھا۔ اس لیے کہ حضرت زید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے اور حضرت زینب حضور کی پھوپھی (اُمَیمہ بنت عبدالمطلب) کی صاحبزادی تھیں۔ ان لوگوں کو یہ بات سخت ناگوار تھی کہ اتنے اونچے گھرانے کی لڑکی، اور وہ بھی کوئی غیر نہیں بلکہ حضورؐ کی اپنی پھوپھی زاد بہن ہے، اور اس کا پیغام آپ اپنے آزاد کردہ غلام کے لیے دے رہے ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور اسے سنتے ہی حضرت زینب اور ان کے سب خاندان والوں نے بلا تامل سرِ اطاعت خم کر دیا۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم

اے نبیؐ، یاد کرو وہ موقع جب تم اُس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے اور

نے ان کا نکاح پڑھایا، خود حضرت زیدؓ کی طرف سے دس دینار اور ۶۰ درہم مہر ادا کیا، چڑھاوے کے کپڑے دیئے، اور کچھ سامانِ خوراک گھر کے خرچ کے لیے بھجوا دیا۔

یہ آیت اگرچہ ایک خاص موقع پر نازل ہوئی ہے، مگر جو حکم اس میں بیان کیا گیا ہے وہ اسلامی آئین کا اصل الاصول ہے اور اس کا اطلاق پورے اسلامی نظامِ زندگی پر ہوتا ہے۔ اس کی رُو سے کسی مسلمان فرد، یا قوم، یا ادارے، یا عدالت، یا پارلیمنٹ، یا ریاست کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ جس معاملہ میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے کوئی حکم ثابت ہو اُس میں وہ خود اپنی آزادی رائے استعمال کرے۔ مسلمان ہونے کے معنی ہی خدا اور رسولؐ کے آگے اپنے آزادانہ اختیار سے دستبردار ہو جانے کے ہیں۔ کسی شخص یا قوم کا مسلمان بھی ہونا اور اپنے لیے اس اختیار کو محفوظ بھی رکھنا، دونوں ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔ کوئی مردِ عاقل ان دونوں رویّوں کو جمع کرنے کا تصور نہیں کر سکتا۔ جسے مسلمان رہنا ہو اس کو لازماً حکمِ خدا و رسول کے آگے جھک جانا ہوگا۔ اور جسے نہ جھکنا ہو اس کو سیدھی طرح ماننا پڑے گا کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ نہ مانے گا تو چاہے اپنے مسلمان ہونے کا وہ کتنا ہی ڈھول پیٹے، خدا اور خلق دونوں کی نگاہ میں وہ منافق ہی قرار پائے گا۔

یہاں سے آیت ۴۸ تک کا مضمون اُس وقت نازل ہوا جب حضرت زینبؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نکاح کر چکے تھے اور اس پر منافقین، یہود اور مشرکین نے آپ کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک طوفانِ عظیم برپا کر رکھا تھا۔ ان آیات کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات اُن دشمنوں کی تفہیم کے لیے نہیں تھے جو قصداً حضورؐ کو بدنام کرنے اور اپنے دل کی جلن نکالنے کے لیے جھوٹ اور بہتان اور طعن و تشنیع کی مہم چلا رہے تھے، بلکہ اصل مقصود مسلمانوں کو اُن کی اس مہم کے اثرات سے بچانا اور ان کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات سے محفوظ کرنا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ کا کلام منکرین کو مطمئن نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے اگر اطمینان نصیب ہو سکتا تھا تو انہی لوگوں کو جو جانتے تھے اور مانتے تھے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ ان بندگانِ حق

تم نے احسان کیا تھا[۶۶] کہ " اپنی بیوی کو نہ چھوڑ اور اللہ سے ڈر"[۶۹]، اُس وقت تم اپنے

کے متعلق اُس وقت یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ دشمنوں کے اعتراضات کہیں ان کے دلوں میں بھی شک اور ان کے دماغوں میں بھی اُلجھن نہ پیدا کر دیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تمام امکانی شبہات کا ازالہ فرمایا، اور دوسری طرف مسلمانوں کو بھی اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ بتایا کہ ان حالات میں ان کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔

[۶۸] مراد ہیں حضرت زید، جیسا کہ آگے بصراحت بیان فرما دیا گیا ہے۔ ان پر اللہ تعالیٰ کا احسان کیا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا احسان کیا؟ اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مختصراً ان کا قصہ بیان کر دیا جائے۔ یہ دراصل قبیلۂ کلب کے ایک شخص حارثہ بن شراحیل کے بیٹے تھے اور ان کی ماں سُعدیٰ بنت ثعلبہ قبیلۂ طے کی شاخ بنی معن سے تھیں۔ جب یہ آٹھ سال کے بچے تھے اس وقت ان کی ماں انہیں میکے لے گئیں۔ وہاں بنی قین بن جسر کے لوگوں نے ان کے پڑاؤ پر حملہ کیا اور لوٹ مار کے ساتھ جن آدمیوں کو وہ پکڑ لے گئے ان میں حضرت زید بھی تھے۔ پھر انہوں نے طائف کے قریب عکاظ کے میلے میں لے جا کر ان کو بیچ دیا۔ خریدنے والے حضرت خدیجہ کے بھتیجے حکیم بن حزام تھے۔ انہوں نے مکہ لا کر انہیں اپنی پھوپھی صاحبہ کی خدمت میں نذر کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت خدیجہ کا جب نکاح ہوا تو حضورؐ نے ان کے ہاں زید کو دیکھا اور ان کی عادات و اطوار آپ کو اس قدر پسند آئیں کہ آپ نے انہیں حضرت خدیجہؓ سے مانگ لیا۔ اِس طرح یہ خوش قسمت لڑکا اُس خیر الخلائق ہستی کی خدمت میں پہنچ گیا جسے چند سال بعد اللہ تعالیٰ نبی بنانے والا تھا۔ اس وقت حضرت زید کی عمر ۱۵ سال تھی۔ کچھ مدت بعد ان کے باپ اور چچا کو پتہ چلا کہ ہمارا بچہ مکہ میں ہے۔ وہ انہیں تلاش کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے اور عرض کیا کہ آپ جو فدیہ چاہیں ہم دینے کے لیے تیار ہیں، آپ ہمارا بچہ ہمیں دے دیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں لڑکے کو بلاتا ہوں اور اسی کی مرضی پر چھوڑے دیتا ہوں کہ وہ تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہے یا میرے پاس رہنا پسند کرتا ہے۔ اگر وہ تمہارے

ساتھ جانا چاہے گا تو میں کوئی فدیہ نہ لوں گا اور اسے یونہی چھوڑ دوں گا۔ لیکن اگر وہ میرے پاس رہنا چاہے تو میں ایسا آدمی نہیں ہوں کہ جو میرے پاس رہنا چاہتا ہو اسے خواہ مخواہ نکال دوں۔ انہوں نے کہا یہ تو آپ نے انصاف سے بھی بڑھ کر درست بات فرمائی ہے، آپ بچے کو بلا کر پوچھ لیجیے۔ حضورؐ نے زیدؓ کو بلایا اور ان سے کہا ان دونوں صاحبوں کو جانتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا جی ہاں، یہ میرے والد ہیں اور یہ میرے چچا۔ آپ نے فرمایا، اچھا، تم ان کو بھی جانتے ہو اور مجھے بھی۔ اب تمہیں پوری آزادی ہے کہ چاہو ان کے ساتھ چلے جاؤ اور چاہو میرے ساتھ رہو۔ انہوں نے جواب دیا میں آپ کو چھوڑ کر کسی کے پاس نہیں جانا چاہتا۔ ان کے باپ اور چچا نے کہا، زید، کیا تو آزادی پر غلامی کو ترجیح دیتا ہے، اور اپنے ماں باپ اور خاندان کو چھوڑ کر غیروں کے پاس رہنا چاہتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے اس شخص کے جو اوصاف دیکھے ہیں اُن کا تجربہ کر لینے کے بعد میں اب دنیا میں کسی کو بھی اس پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ زیدؓ کا یہ جواب سُن کر ان کے باپ اور چچا بخوشی راضی ہو گئے۔ حضورؐ نے اسی وقت زید کو آزاد کر دیا اور حرم میں جا کر قریش کے مجمع عام میں اعلان فرمایا کہ آپ سب لوگ گواہ رہیں، آج سے زید میرا بیٹا ہے، یہ مجھ سے وراثت پائے گا اور میں اس سے۔ اسی بنا پر لوگ ان کو زید بن محمدؐ کہنے لگے۔ یہ سب واقعات نبوّت سے پہلے کے ہیں۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصبِ نبوت پر سرفراز ہوئے تو چار ہستیاں ایسی تھیں جنہوں نے ایک لمحہ شک و تردُّد کے بغیر آپ سے نبوّت کا دعویٰ سنتے ہی اسے تسلیم کر لیا۔ ایک حضرت خدیجہؓ، دوسرے حضرت زیدؓ، تیسرے حضرت علیؓ، اور چوتھے حضرت ابو بکرؓ۔ اُس وقت حضرت زید کی عمر ۳۰ سال تھی اور ان کو حضورؐ کی خدمت میں رہتے ہوئے ۱۵ سال گزر چکے تھے۔

ہجرت کے بعد ۴ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ سے ان کا نکاح کیا، خود اپنی طرف سے ان کا مہر ادا کیا، اور گھر بسانے کے لیے ان کو ضروری سامان عنایت فرمایا۔

دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ کھولنا چاہتا تھا، تم لوگوں سے ڈر رہے تھے، حالانکہ اللہ اِس کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ پھر جب زید اُس سے اپنی

یہی حالات ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ اِن الفاظ میں اشارہ فرمارہا ہے کہ "جس پر اللہ نے اور تم نے احسان کیا تھا"۔

۵۹؎ یہ اُس وقت کی بات ہے جب حضرت زیدؓ سے حضرت زینبؓ کے تعلقات انتہائی کشیدہ ہو چکے تھے۔ اور انہوں نے بار بار شکایات پیش کرنے کے بعد آخرکار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ میں ان کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔ حضرت زینبؓ نے اگرچہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم مان کر ان کے نکاح میں جانا قبول کر لیا تھا، لیکن وہ اپنے دل سے اس احساس کو کسی طرح نہ مٹا سکیں کہ زید ایک آزاد کردہ غلام ہیں، اُن کے اپنے خاندان کے پروردہ ہیں، اور وہ عرب کے شریف ترین گھرانے کی بیٹی ہونے کے باوجود اس کم تر درجے کے آدمی سے بیاہی گئی ہیں۔ اس احساس کی وجہ سے ازدواجی زندگی میں انہوں نے کبھی حضرت زید کو اپنے برابر کا نہ سمجھا، اور اسی وجہ سے دونوں کے درمیان تلخیاں بڑھتی چلی گئیں۔ ایک سال سے کچھ ہی زیادہ مدت گزری تھی کہ نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔

۶۰؎ بعض لوگوں نے اس فقرے کا اُلٹا مطلب یہ نکال لیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود حضرت زینبؓ سے نکاح کے خواہشمند تھے، اور آپ کا جی چاہتا تھا کہ حضرت زید ان کو طلاق دیدیں، مگر جب انہوں نے آکر عرض کیا کہ میں بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہوں تو آپ نے معاذ اللہ اوپری دل سے ان کو منع کیا، اس پر اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ "تم دل میں وہ بات چھپا رہے تھے جسے اللہ ظاہر کرنا چاہتا تھا"۔ حالانکہ اصل بات اس کے بالکل برعکس ہے۔ اگر آیات نمبر ۱-۲-۳ اور ۷ کے ساتھ ملا کر یہ فقرہ پڑھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ جس زمانے میں حضرت زید اور ان کی اہلیہ کے درمیان تلخی بڑھتی چلی جارہی تھی اُسی زمانے میں اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اشارہ کر چکا تھا کہ زید جب اپنی بیوی کو طلاق دیں تو ان کی مطلقہ خاتون سے آپ کو نکاح کرنا ہوگا۔ لیکن چونکہ حضور

حاجت پوری کر چکا تو ہم نے اس (مطلقہ خاتون) کا تم سے نکاح کر دیا تاکہ مومنوں پر اپنے

جانتے تھے کہ عرب کی اس سوسائٹی میں منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کرنا کیا معنی رکھتا ہے
— اور وہ بھی عین اس حالت میں جبکہ مٹھی بھر مسلمانوں کے سوا باقی سارا عرب آپ کے خلاف
پہلے ہی خار کھائے بیٹھا ہے — اس لیے آپ اس شدید آزمائش میں پڑنے سے ہچکچا رہے
تھے۔ اسی بنا پر جب حضرت زیدؓ نے بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ ظاہر کیا تو حضورؐ نے ان سے
فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور اپنی بیوی کو طلاق نہ دو۔ آپ کا منشا یہ تھا کہ یہ شخص طلاق نہ دے
تو میں اس بلا میں پڑنے سے بچ جاؤں، ورنہ اس کے طلاق دے دینے کی صورت میں مجھے
حکم کی تعمیل کرنی ہوگی اور پھر مجھ پر وہ کیچڑ اچھالی جائے گی کہ پناہ بخدا۔ مگر اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو
اولوالعزمی اور رضا بقضا کے جس بلند مرتبے پر دیکھنا چاہتا تھا اس کے لحاظ سے حضورؐ کی یہ بات
اس کو فروتر نظر آئی کہ آپ نے قصداً زید کو طلاق سے روکا تاکہ آپ اس کام سے بچ جائیں
جس میں آپ کو بدنامی کا اندیشہ تھا، حالانکہ اللہ ایک بڑی مصلحت کی خاطر وہ کام آپ سے
لینا چاہتا تھا۔ "تم لوگوں سے ڈر رہے تھے، حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے
ڈرو" کے الفاظ صاف صاف اسی مضمون کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

یہی بات اس آیت کی تشریح میں امام زین العابدین حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ نے
فرمائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دے چکا تھا کہ زینب آپ کی بیویوں
میں شامل ہونے والی ہیں، مگر جب زید نے آکر ان کی شکایت آپ سے کی تو آپ نے ان سے فرمایا
کہ اللہ سے ڈرو اور اپنی بیوی کو نہ چھوڑو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمہیں پہلے خبر دے چکا تھا
کہ میں تمہارا نکاح زینب سے کرنے والا ہوں، تم زید سے یہ بات کہتے وقت اس بات کو چھپا
رہے تھے جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا" (ابن جریر۔ ابن کثیر بحوالہ ابن ابی حاتم)

علامہ آلوسی نے بھی تفسیر روح المعانی میں اس کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ
"یہ عتاب ہے ترک اولیٰ پر۔ اس حالت میں اولیٰ یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہتے،

منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملہ میں کوئی تنگی نہ رہے جبکہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں۷۲۔ اور اللہ کا حکم تو عمل میں آنا ہی چاہیے تھا۔ نبی پر کسی ایسے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہو۷۳۔ یہی اللہ کی سنّت اُن سب انبیاء کے

یا زید سے فرما دیتے کہ تم جو کچھ کرنا چاہو کر سکتے ہو۔ عتاب کا ماحصل یہ ہے کہ تم نے زید سے یہ کیوں کہا کہ اپنی بیوی کو نہ چھوڑو، حالانکہ میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا تھا کہ زینب تمہاری بیویوں میں شامل ہونگی۔“

۷۱ یعنی جب زید نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی اور ان کی عدت پوری ہو گئی۔ ”حاجت پوری کر چکا“ کے الفاظ سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ زید کی اس سے کوئی حاجت باقی نہ رہی۔ اور یہ صورتِ حال محض طلاق دے دینے سے رونما نہیں ہوتی، کیونکہ عدت کے دوران میں شوہر کو اگر کچھ دلچسپی باقی ہو تو وہ رجوع کر سکتا ہے، اور شوہر کی یہ حاجت بھی مطلقہ بیوی سے باقی رہتی ہے کہ اس کے حاملہ ہونے یا نہ ہونے کا پتہ چل جائے۔ اس لیے مطلقہ بیوی کے ساتھ اس کے سابق شوہر کی حاجت اُسی وقت ختم ہوتی ہے جب عدت گزر جائے۔

۷۲ یہ الفاظ اس باب میں صریح ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نکاح خود اپنی خواہش کی بنا پر نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی بنا پر کیا۔

۷۳ یہ الفاظ اس بات کی صراحت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کام نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ایسی ضرورت اور مصلحت کی خاطر کرایا جو اس تدبیر کے سوا کسی دوسرے ذریعہ سے پوری نہ ہو سکتی تھی۔ عرب میں منہ بولے رشتوں کے بارے میں جو غلط تصور صدیوں سے قائم تھا اور اس کی وجہ سے معاشرے میں جو غلط رسوم رائج ہو گئی تھیں، ان کے توڑنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ اللہ کا رسول خود آگے بڑھ کر ان کو توڑ ڈالے۔ لہٰذا یہ نکاح اللہ تعالیٰ نے محض نبی کے گھر میں ایک بیوی کا اضافہ کرنے کی خاطر نہیں بلکہ ایک اہم ضرورت کی خاطر کروایا۔

۷۴ ان الفاظ میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ دوسرے مسلمانوں کے لیے تو یہ کام محض مباح ہے

معاملہ میں رہی ہے جو پہلے گزر چکے ہیں اور اللہ کا حکم ایک قطعی طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے۔[۵۷]
(یہ اللہ کی سنت ہے اُن لوگوں کے لیے) جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اسی سے
ڈرتے ہیں اور ایک خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، اور محاسبہ کے لیے بس اللہ ہی کافی ہے۔[۵۸]

مگر نبی کے لیے یہ ایک فرض تھا جو اللہ نے اس پر عائد کیا تھا۔ اور جب اللہ کوئی کام نبی پر فرض کر دے تو دنیا کی کوئی طاقت اور کوئی رکاوٹ اس کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی۔ خواہ ساری دنیا اس کی مخالف ہو، نبی بہرحال اس کام کو کر کے رہے گا۔

۵۷ یعنی انبیاء کے لیے ہمیشہ سے یہ ضابطہ مقرر رہا ہے کہ اللہ کی طرف سے جو حکم بھی آئے اس پر عمل کرنا ان کے لیے قضائے مبرم ہے جس سے کوئی مفر اُن کے لیے نہیں ہے۔

۵۸ اصل الفاظ ہیں کفیٰ باللہ حسیبًا۔ اس کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ ہر خوف اور خطرے کے مقابلے میں اللہ کافی ہے۔ دوسرے یہ کہ حساب لینے کے لیے اللہ کافی ہے، اس کے سوا کسی اور کی باز پرس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

مطلق العنان اقتدار کے تحت محدود مذہبی مناصب

اولین تجربہ ـــــ عباسی دور میں

ـــــ نعیم صدیقی ـــــ

(۶)

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، خلیفہ ہارون الرشید نے ایک بار امام محمدؒ کے سامنے یہ معاملہ رکھا کہ بنو تغلب کے نصاریٰ نے حضرت عمرؓ کے دور میں جو معاہدہ کیا تھا اور اس کے ذریعے اپنے لیے امان حاصل کی تھی، اس کی انہوں نے خلاف ورزی کی ہے۔ معاہدہ میں انہوں نے اقرار کیا تھا کہ وہ اپنی اولادوں کو عیسائی نہیں بنائیں گے مگر بعد میں اس اقرار کے خلاف عمل کرنے لگے۔ پھر کیا اس نقضِ عہد کی وجہ سے ان کا خون مباح نہیں ہو جاتا؟ ظاہر بات ہے کہ فرماں رواؤں کے اس طرح کے کسی استفتاء کے پیچھے سیاسی مصالح کارفرما ہوتے تھے اور اس کا عندیہ جھلک رہا ہوتا تھا، نہ یہ کہ محض علمی ضرورت سے سوال کیا جا رہا ہو۔ امام محمدؒ ہارون الرشید کے مصالح اور عندیہ سے بالکل صرفِ نظر کر کے صاف صاف جواب دیتے ہیں کہ یہ صلح حضرت عمرؓ کے دور میں قائم ہوئی اور بعد کے خلفاء نے اسے برقرار رکھا تو اب جبکہ کوئی نئی بات پیدا نہیں ہوئی، اس میں آپ کی دست اندازی کا کوئی موقع نہیں ہے۔ ان کی جس خلاف ورزی کا آپ ذکر کر رہے ہیں جب سے حضرت عثمانؓ نے جو آپ کے ابنِ عم تھے، انگیز کر لیا اور یہی صورت بعد میں برقرار رہی تو اب آپ اس معاہدہ کو کالعدم نہیں قرار دے سکتے۔ ہارون نے اس مدلّل قولِ حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور امام کی حق گوئی کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو مالِ کثیر دیا جسے امام نے مستحقین میں تقسیم

کر دیا۔[1] اس سے اندازہ کیجیے کہ مسلمان حکمرانوں کے ساتھ وہ کونسی قوت وابستہ تھی جس نے اقلیتوں کے حقوق کو بچانے کے لیے اپنے آپ کو خطرے کے منہ میں دینا تک گوارا کیا۔

فرماں روا کی طرف سے استفتا کے بغیر بھی علمائے حق خلافِ شریعت معاملات میں آڑے آتے تھے، جس کی ایک مثال ہم بیان کر چکے ہیں کہ مامون کے دور میں جب متعہ اور دیگر حرمتوں کو حلال کرنے کے لیے کتاب لکھ کر دربار میں لائی گئی تو قاضی یحییٰ بن اکثم نے خود آگے بڑھ کر اس کا ابطال کیا۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ علمائے حق نے مناصب قبول کرنے اور درباروں میں قدم رکھنے کے بعد علمِ دین کے احترام کا تحفظ بھی بڑی مضبوطی سے کیا۔ انہوں نے دین اور علمِ دین کی حرمت کو بچانے کے لیے اپنے آپ کو درباداری کی گراوٹوں سے بچانے کی کوششیں کیں۔ اس کی بہت سی مثالوں میں سے ہم یہاں ایک ہی کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک بار ہارون الرشید مجلس میں آیا تو تمام لوگ تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ مجلس میں امام احمد موجود تھے، وہ نہیں اُٹھے۔ ہارون اس واقعہ سے کیسے صرفِ نظر کر لیتا، امام سے باز پرس کی کہ آپ کیوں نہیں اُٹھے؟ امام نے اس کا جو جواب دیا وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بہترین مثال تھا۔ فرمایا کہ جب آپ نے مجھے اربابِ علم کے زمرہ میں جگہ دی ہے تو مجھے پسند نہیں کہ نوکروں اور خدمت گاروں میں شامل ہوں۔ ساتھ ہی حدیثِ سرکارِ رسالت مآب پڑھی کہ جو شخص یہ خواہش کرے کہ لوگ اس کے اعزاز میں کھڑے ہوں تو اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا لے۔ کیسی سخت ضرب تھی بادشاہت کے مزاج پر، مگر ہارون کو اعتراف کرتے ہی بنی اور کہا کہ آپ نے درست فرمایا۔[2] یعنی علمائے حق نے اپنے آپ کو ملازمانہ ذہنیت

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی، ج ۲، ص ۱۷۳، ۱۷۴۔ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی از مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم ص ۳۷۷ تا ۳۸۰۔ غلامانِ اسلام از مولانا سعید احمد ایم۔ اے۔ ص ۲۵۷، ۲۵۸۔

[2] امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی از مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم ص ۱۲۔ غلامانِ اسلام از مولانا سعید احمد ایم اے ص ۲۵۷

تک کا شکار ہونے سے بچایا جس کی بنیاد حرصِ مال وجاہ پر ہوتی ہے اور یہ حرصِ مال وجاہ آدمی کو روباہی کا ذوق دیتی ہے، خوشامد کا فن سکھاتی ہے اور بالآخر اندھی غلامی تک پہنچا دیتی ہے ان حضرات نے نہ اپنی روح بیچی اور نہ اپنے ضمیر کو گروی رکھا اسی بلند خودی کے زور سے وہ مطلق العنان فرماں رواؤں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سچائی کا پیغام درباروں میں سناتے اور بادشاہوں کو حق کے کڑوے گھونٹ حلق سے اتارنے پڑتے۔ جیسے کہ ایک بار عبداللہ ابن طاؤس نے منصور سے خطاب کر کے کہا تھا کہ "آخرت میں سب سے زیادہ عذاب اس شخص کو ہوگا جسے اللہ نے حکومت میں سے حصہ دیا اور اس نے حکمرانی کرتے ہوئے ظلم کو روا رکھا"[۱] اور کلمۃ الحق عند سلطان جائر کی ایسی مثالیں اکا دکا نہیں بے شمار ہیں۔

ایسے علمبردارانِ صداقت کو خداوند تعالیٰ ایک باطنی قوت سے آراستہ کرتا ہے جس کا خاص رعب ہوتا ہے پھر ان کو خلق میں خاص اثر و وقار حاصل ہوتا ہے اور رائے عام ان کا ساتھ دیتی ہے۔ علمائے حق اسی باطنی روحانی قوت اور جمہوری اثر کی وجہ سے فرماں رواؤں کے مقابلے پر جمے رہتے تھے اور فرمانرواؤں کے دل ان سے لرزہ کھاتے تھے۔ اس قوت و اثر کی ایک بہترین مثال ہمیں یزید بن ہارون السلمی کی شخصیت میں ملتی ہے۔ مامون خلق قرآن کے متعلق اپنے دعویٰ کا اعلان کرنے میں انہی ابن ہارون کی وجہ سے تادیر متامل رہا۔ اس کا اپنا قول ہے کہ اگر یہ شخص نہ ہوتا تو میں عقیدۂ خلقِ قرآن کا اعلان کرتا، کیونکہ اگر اس نے میری تردید کی تو لوگوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔ خدا کے اس بندے کی جرأت تھی کہ بے دھڑک پکار پکار کر کہا کہ جو شخص خلقِ قرآن کا قائل ہے وہ کافر ہے[۲]

مطلق العنان اقتدار کے مقابلے پر علمائے دین حق کے تحفظ کی جو خاموش جنگ لڑ رہے تھے اسے زیادہ سرگرم اور موثر بنانے میں امام ابوحنیفہ کا حصہ بڑا ہی گراں بہا ہے۔ امام نے

---

۱ ابن خلکان۔ ج ۱، ص ۲۳۳۔ غلامانِ اسلام از مولانا سعید احمد ایم۔ اے۔ ص ۱۴۰

۲ غلامانِ اسلام۔ از مولانا سعید ایم۔ اے۔ ص ۲۹۴ - ۲۹۵۔

منتفرق انفرادی مساعی سے آگے بڑھ کر اس مقصد کے لیے ایک مضبوط ادارہ کی شکل میں ایک منظم محاذ پیدا کر دیا۔ ہمیں امام کے اس عظیم الشان کارنامے کا ایک اجمالی جائزہ لینا ہے۔

امام ابوحنیفہ کی انقلابی شخصیت امام ابوحنیفہ کی شخصیت تاریخی اعتبار سے فی الحقیقت ایک انقلابی شخصیت ہے جس کا ضمیر اسلام سے ہٹی ہوئی ہیئت سیاسیہ سے متصادم رہا۔ ہم امام کے انقلابی عمل کا سرسری تذکرہ پہلے کر چکے ہیں۔ انہوں نے زید بن علی اور محمد بن حنفیہ کی تحریکوں کا ساتھ دیا اور کوفہ میں بیٹھ کر ایک طرف مال سے انقلابی حرکت کی تائید کی اور دوسری طرف افراد کو اس میں حصہ لینے پر تیار کیا۔ پھر اس جرم عشق کی وجہ سے جب استبداد کی چکی میں پسنے کا موقع آیا تو ایک جبلِ استقامت ثابت ہوئے۔ اگر حضرت امام ابوحنیفہ نے اس کام کے علاوہ جو پوری طرح بار آور بھی نہ ہو سکا، کوئی دوسری خدمت دین و ملت کی نہ بھی انجام دے سکتے جب بھی وہ ہمارے ان محسن اسلاف کی صف اول میں جگہ پاتے جن کے کارناموں نے پورے ایوانِ تاریخ کو ہمیشہ کے لیے روشن کر دیا ہے۔ ان کے علمی کارنامہ نے ان کی عظمت کو مزید چار چاند لگا دیئے ہیں لیکن تاریخ کے طالب علم کو یہ حقیقت بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ امام کا علمی کارنامہ بھی ان کے سیاسی کارنامہ ہی کی ایک کڑی تھا، اور اس کے پیچھے بھی وہی جذبۂ انقلاب کام کر رہا ہے۔ پس ان کے علمی کارنامہ کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ ان کے سیاسی کردار کو سمجھا جائے۔

امام کی انقلابی شخصیت ایک پہلو سے ہماری پوری تاریخ میں بے مثل اور ممتاز ہے۔ ہمیں دوسری انقلابی شخصیتیں زیادہ تر ایسی نظر آتی ہیں — اور وہ اپنی جگہ بے حد مبارک ہیں — جو اٹھیں، سیاسی قوت سے ٹکرائیں اور ختم ہو کر ہمیشہ کے لیے ایک پیغام بن گئیں ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

وہ معاشرہ کے احساس کو جھنجھوڑ کر نکل گئے۔ یہ سینۂ عقل کو محوِ تماشائے لبِ بام چھوڑ کر

بے خطر آتشِ عشق میں کود گئیں۔ وہی بات کہ ع

بازی اگرچہ لے نہ سکا، سر تو کھو سکا

ہماری تاریخ کے بیشتر انقلابیوں کو مستبد بادشاہت کے نیچے چونکہ منظم آئینی تحریک چلانے کا راستہ نہیں ملا، اور چونکہ انہیں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ ایک غلط نظام کے نیچے پڑے پڑے معاشرہ اس کا خوگر ہو جائے اور اس کے لیے غلط اور صحیح کا فرق کرنے والا شعور اور تبدیلی کی رو اٹھانے والی حس ہی باقی نہ رہے: اس لیے یا تو انہوں نے مسلح بغاوت اٹھائی اور یا پھر تن تنہا نعرۂ حق بلند کیا اور جامِ شہادت نوش کر کے خاموش ہو گئے مگر ان کے نعرے نے وقت پر معاشرہ کو ایک زلزلہ کی طرح جھنجھوڑ دیا اور بعد میں تاریخ کے گنبد سے اس نعرہ کی صدائے بازگشت رہتی دنیا تک سنائی دیتی رہے گی۔ ان کے خون کے قطرے مٹی میں ملے تو کتنے ہی آنے والے انقلابات کے لیے بیج قرار پائے۔ ان کی وجہ سے آج تک ملتِ اسلامیہ گرم خوں ہے۔

مگر امام ابوحنیفہ دل میں انقلاب کی جو آگ رکھتے تھے وہ ٹھنڈی آگ تھی جو معاً بھڑکنے کے بجائے تادیر سلگ سکتی تھی۔ ان کا حال وہ "گیلے بن کی لاکڑی" کا سا تھا جس کی شان تھی "سلگت ہوں دن رین"۔ جذبہ ہائے آتشیں سینے میں رکھ کر اپنے طرزِ فکر کو ٹھنڈا بھی رکھنا، جوش کا طوفان اُبلتے ہوئے اس میں ہوش کی کشتی کو بھی سلامتی سے آخر دم تک کھیتے چلے جانا امام ابوحنیفہ کو اسلامی تاریخ کے مایۂ ناز انقلابیوں سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کے ہاں عالم کا دماغ اور انقلابی کا دل یوں بہم آمیز تھے کہ ؎

روئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش است

ان کا جنون "حکیمانہ با شام و برد" کا مسلک رکھتا تھا۔ مقصد کے لیے جذبہ عاشقانہ، مگر طریقۂ حصولِ مقصد کے لیے طرزِ فکر حکیمانہ۔ اس موقعہ پر حضرت امام ابوحنیفہ کے سیاسی طرزِ فکر اور طریقِ کار کے چند اہم پہلو زیرِ مطالعہ آنے چاہییں۔ یہ ضمنی گفتگو اجمالی کے باوجود

طویل ہو جائے تو مجبوری ہے۔

(۱) امام ابو حنیفہؒ کے حکیمانہ فکر کا اولین مظہر تو یہی امر واقعہ ہے کہ انہوں نے زیر زمین (Under-Ground) کام کرنے کا طریقہ پورے شرح صدر سے اختیار کیا اور یہ ان کے اجتہاد پسند ذہن کا کرشمہ تھا۔ ان کے سارے فقہی اجتہادات ایک طرف اور یہ ایک سیاسی اجتہاد ایک طرف۔ حضورؐ کا نمونے کا کام کھلا کھلا کام تھا، صرف دعوت کا ابتدائی دور ایسا ہے کہ بڑی احتیاط کے ساتھ خاص خاص افراد تک خاص خاص افراد کے ذریعے پیغام پہنچایا گیا۔ مگر یہ دور جو "فاصدع بما تؤمر" کے فرمانِ آسمانی سے ختم کر دیا گیا ایسا نہیں کہ اسے پوری طرح خفیہ تحریک کہا جا سکے۔ پھر اس کا مقصد کسی کے تحتِ اقتدار کو الٹنا بھی نہ تھا۔ مقصود فقط اتنا تھا کہ قبل اس کے کہ جاہلی معاشرہ کسی جذباتی ہیجان میں پڑ جائے مکہ کے جوہرِ قابل میں سے مردانِ کار کا زیادہ سے زیادہ ابتدائی سرمایہ اسلام کے گرد جمع کر لیا جاتے۔ پھر خلفائے راشدین کے دور میں تو معاشرہ اسلام کے زیر نگیں تھا اور بیرونی طاقتوں نے اپنی قسمت کا فیصلہ خود ہی میدان جنگ میں کرانا پسند کیا۔ البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف۔ باغی عنصر نے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف خوارج نے کچھ خفیہ کام بھی کیا مگر وہ کسی مومن کے لیے اسوہ نہیں ہو سکتا۔ بعد میں ایک مثال مسلم بن عقیل کی ہے، جنہوں نے امام حسینؓ کی طرف سے کوفہ میں خفیہ بیعت لینے کی حد تک کام کیا لیکن امام حسینؓ خود علی الاعلان بادشاہت کے خلاف اٹھ چکے تھے اور ان کی اصل تحریک میں کوئی اخفا نہ تھا۔ بہرحال حضرت امام ابو حنیفہ گویا نفسِ زکیہ کی تحریک کا کوفہ میں ہمہ تن ایک خفیہ مرکز تھے۔ زیر زمین کام کرنا بڑے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ ممکن ہے، کوئی "گرم خون" آدمی اس ذمہ داری کو نبھا نہیں سکتا۔ اس کام میں دماغ، جذبات اور زبان پر پورا پورا قابو درکار ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ آدمی کے لہجے اور رنگِ رخ کی تبدیلیاں بھی یہ غمازی نہ کریں کہ ذہنی کیفیت کیا ہے۔

درحقیقت جب کھلے میدان میں اظہارِ اختلاف کے دروازے بند کر دیئے جائیں،

جب جبر و استبداد کی فضا میں برسرِ عام کوئی دعوت دینا اور ایک خیال کے لوگوں کو منظم کرنا خارج از امکان کر دیا جائے، دوسرے لفظوں میں تبدیلی کی پُرامن آمد کی گنجائش نہ چھوڑی جائے تو تاریخ بتاتی ہے کہ پھر دو ہی راستے رہ جاتے ہیں: ایک مسلّح بغاوت، دوسرے سازش یا زیرِ زمین تحریکات۔ زید بن علی اور محمد بن حنفیہ کو حقیقی قوت ہاتھ آتی اس کے بل پر انھوں نے پہلا راستہ اختیار کیا مگر بغاوت کی ان دونوں حرکات کا پنپنا بغیر اس کے ممکن نہ تھا کہ ان کو افراد، اموال اور آراء کے ذریعے مسلسل تقویت پہنچے۔ یہ کام تختِ استبداد کے سایے میں کھلے بندوں کرنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ حضرت امام ابو حنیفہؒ نے یہی راستہ اختیار کیا۔ ان کی سرگرمیٔ کار کے لیے ہم اس سے پہلے لفظ "جہادؒ" استعمال کر چکے ہیں۔ مگر اس سے مراد ان کی سرگرمی اور انہماک ہے، نیز تاریخ بتاتی ہے کہ اچھے خاصے بڑے پیمانے کا کام انہوں نے کر ڈالا۔ یعنی ان کے سیرت نگاروں کا منشا یہ ہے کہ خوب زور شور سے انہوں نے کام کیا۔ آخر ان کے سامنے ایک نہایت ہی فیصلہ کن بازی لگ رہی تھی جس کے نتیجے میں معاشرے کی تقدیر کا رخ قرنوں کے لیے معین ہونے والا تھا۔ بہرحال انہوں نے اسلامی انقلاب کے کسی ایک ہی لگے بندھے نسخے کو اجزا کے ردو بدل کے بغیر استعمال کرنے کے بجائے حالات کے مطابق صحیح اور موزوں نسخہ اختیار کر لیا۔

(۲) زیرِ زمین کام کرنے والے انقلابی کے لیے ایک خصوصیت یہ لازم ہے کہ وہ آسانی سے نہ اپنے مخالف کی گرفت میں آئے اور نہ قانون کا ہاتھ اپنے پٹھے پر پڑنے دے۔ ورنہ اگر ایسا آدمی ہر بات کو فاش کہہ دے۔ ہر سوال کرنے والے کے ظاہراً معصومانہ اور باطناً مفسدانہ سوالوں کے دام میں آ سکے، کسی بھی جوشش انگیز متکلم

ؔ تاریخ القضا فی الاسلام — از محمد بن محمود عرنوس مصری ص ۷۴ (بحوالہ واقدی)۔ الیافعی الشافعی — ج ۱ ص ۳۰۰۔ مناقب موفق — ج ۱، ص ۸۴ و ۱۷۱۔

کی ذہنی تحریک پر کھل جائے تو سارا منصوبہ ختم ہو کر رہ جائے۔ چنانچہ حضرت امام ابوحنیفہ اس صلاحیت سے آراستہ تھے۔ اور اس سے انہوں نے خوب خوب کام لیا۔

امام ابوحنیفہؒ کے برعکس کھلے اور پرجوش انقلابی کا رنگ دیکھنا ہو تو تحریکِ بغاوت کے ایک لیڈر ابراہیم بن میمون کی مثال ملاحظہ کیجیے۔ ابومسلم خراسانی کی ان پر نظر تھی مگر موادِ ثبوت نہ تھا کہ ان کے بارے میں کوئی قطعی اقدام کر سکے۔ کارِ خاص کا آدمی ان کے پاس بھیجا اور ان پر سوال کیا گیا کہ کیا ابومسلم خراسانی پر قاتلانہ حملہ کرنا جائز ہے؟ انہوں نے بلاتامل اثبات میں جواب دیا۔ یوں ان کا نقطۂ نظر اچھی طرح سامنے آگیا[۱] ان کا پورا کام اسی مزاج کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے براہِ راست ابومسلم خراسانی کو پہلے نرمی سے نصیحت کی، پھر نہایت سختی سے دعوت دی۔ نتیجہ یہ کہ گرفتار کر لیے گئے۔ علماء کی سفارش سے رہائی پائی۔ رہائی کے بعد مذکورہ بالا فتویٰ ابومسلم خراسانی کے خاص فرستادے کے سامنے دیا۔ حد یہ کہ آخری ملاقات میں اس سے یہ کہہ آئے کہ میں تیرے خلاف جہاد کرنا چاہتا ہوں، اقتدار ہاتھ میں نہیں ہے لہٰذا زبان سے جہاد کروں گا۔ بلکہ یہ تک اسے سنا دیا کہ میں اللہ کی خاطر تجھ سے بغض رکھتا ہوں۔ آخر ابومسلم خراسانی نے انہیں قتل کر دیا[۲]

اب ذرا امام ابوحنیفہ کا ٹھنڈا مدبرانہ طرز ملاحظہ ہو کہ راکھ کے ڈھیر میں گرم چنگاریاں چھپا رکھنے والوں کو جب تلوار سے تیز اور بال سے باریک راستے پر چلنا پڑتا ہے تو وہ کس طرح اپنا توازن برقرار رکھتے ہیں۔ اس صلاحیت کی ایک مثال تو وہ ہے جب حضرت ابوحنیفہ کو کوفہ میں خارجیوں کی عارضی حکومت کے دور میں گرفتار کر کے فاتح کوفہ

---

[۱] مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کی رائے میں یہ فتویٰ ابراہیم کے سر یونہی تھوپا گیا تھا۔ مگر فی الجملہ ان کا طرزِ فکر سخت تھا۔ [۲] امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی از مولانا گیلانی مرحوم ص ۱۸۶، ۱۸۷

ضحاک خارجی کے سامنے یہ کہہ کر پیش کیا گیا کہ یہ ہے اہلِ کوفہ کا سربراہ۔ خارجی معمول کے مطابق (جس کا اولین تجربہ حضرت علیؓ پر کیا گیا تھا) امام سے مطالبہ کیا گیا: "یاشیخ! کفر سے توبہ کرو۔" توبہ کرنے کے معنی اپنے کفر کا اعتراف کرنے کے تھے اور پھر اس مفہوم کے ساتھ جو خارجیوں کا تھا۔ مگر کیا خوب راہ نکالی امام ابوحنیفہ نے، فرمایا: "انا تائب من کل کفر" یعنی میں ہر کفر سے تائب ہوں (اس جملے میں یہ مفہوم بھی مضمر تھا کہ پہلے سے تائب ہوں)۔ چھوڑ دیئے گئے۔ کسی درباری نے ضحاک کے کان بھرے کہ اس شخص کی مراد کفر سے خارجی عقاید ہیں۔ پھر بلائے گئے اور سوال کیا گیا کہ کیا کفر سے تمہاری مراد ہم لوگوں کے عقاید ہیں۔ امام نے ہاں یا نہیں اس سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا یہ سوال کر دیا کہ آپ کی یہ بات گمان پر مبنی ہے یا یقین ہے کہ میں نے کفر سے یہ مراد لی ہے۔ خارجی سردار نے جواب دیا کہ صرف گمان اور ظن ہے۔ امام نے "ان بعض الظن اثم" پڑھ کر فرمایا کہ آپ نے گناہ کا ارتکاب کیا ہے اور گناہ آپ لوگوں کے عقیدہ کے مطابق کفر ہوتا ہے اور آدمی کو خارج از اسلام کر دیتا ہے۔ اس لیے پہلے آپ اس کفر سے توبہ کیجیے۔ خارجی سردار نے توبہ کی اور امام سے مطالبہ کیا کہ اب تم بھی توبہ کرو۔ امام نے فرمایا: میں ہر قسم کے کفر سے اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں توبہ کرتا ہوں۔ رہا کر دیئے گئے۔[1]

ابن ہبیرہ کے ہاں ایک مرتبہ امام کا جانا ہوا اور موقع کچھ ایسا نکلا کہ ابن ہبیرہ نے سرکاری پالیسی (جس کا منشا علماء کو قریب لانا تھا) کے تحت بڑے نرم انداز سے درخواست کی کہ اے شیخ! اگر ہمارے یہاں ذرا زیادہ آمد و رفت رکھیں تو آپ سے ہم فائدہ

---

[1] مناقب موفق۔ ج ۱۔ ص ۱۷۱۔ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی از مولانا مناظر احسن گیلانی ص ۱۲۷۔

اٹھائیں اور آپ کو ہم سے فائدہ پہنچے۔ امام کا جواب کیا ہی نپا تلا تھا کہ میں آپ کے یہاں آکر کیا کروں گا، آپ اگر مجھے قریب دیں گے تو آزمائش میں ڈال دیں گے اور دور ہٹا دیں گے تو رسوائی میں ڈال دیں گے۔ اس مختصر سے جملے کے پیچھے اس دور کے سارے حالات کا عکس موجود ہے اور وہ بیان کیے بغیر بیان بھی ہو گئے اور تلخی کا کوئی پہلو بھی نہ نکلا۔ امام نے مزید یہ کہا کہ تمہارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جس کی مجھے آرزو ہو اور نہ میرے پاس ایسی کوئی چیز ہے جس کی وجہ سے مجھے آپ کی طرف سے ڈر لاحق ہو۔[1] کتنی بلیغ بات کہی۔ کہنے کی بات اس طرح کہہ دینا کہ اقتدار کا معشوق ہزار شیوہ اسے سمجھ بھی جائے بڑی ذہنی ریاضت کے بعد ہی ممکن ہے۔

ان دو مثالوں سے بڑھ کر وہ مثال ہے جبکہ امام ابو حنیفہ کو ابو العباس السفاح کے سامنے دینی و سیاسی حیثیت سے ایک اہم عہد و اعلان کرنا پڑا۔ یہ واقعہ عام تاریخوں میں زیادہ نمایاں ہو کر نہیں آیا مگر حنفیہ کے لٹریچر میں ابو یوسف جیسی ذمہ دار ہستی نے داؤد طائی کے حوالے سے اسے بیان کیا ہے کہ سفاح نے کوفہ میں تخت بچھاتے ہی علماء کو طلب کیا اور ان کے سامنے ایک تقریر کر کے ان سے لوگوں کی بیعت چاہی۔ تمہید میں اس نے کہا کہ آخر خلافت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان والوں تک لوٹ آئی اور خدا نے حق کو قائم کر دیا۔ اس کے بعد اصل مطلب کی بات یوں کہی:

"اور آپ لوگ جو علماء کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ اس حق کی اعانت کے لیے آگے بڑھیں ——————
اعلان کیا جاتا ہے کہ اس کے صلے میں آپ کے ساتھ داد و دہش کی جائیگی۔

---

[1] مناقب موفق۔ ج ۱، ص ۱۷۲، ۱۷۳۔ امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی —— از مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم۔ ص ۱۳۱، ۱۳۲۔

آپ کی عزت بڑھائی جائیگی اور اللہ کے مال سے آپ لوگوں کی خواہش کے مطابق خدمت کی جائیگی۔ پس چاہیئے کہ جس شخص کے حصے میں خلافت آئی ہے۔ اس کے ہاتھ پر آپ بیعت کریں۔ یہ بیعت حجت ہوگی۔ آپ کے حقوق کی بھی اور آپ کے فرائض کی بھی ..... "

تاریخ اسلامی کا ایک عظیم خون ریز حکمران جو نیا نیا فاتح بھی تھا یہ مطالبہ کر رہا تھا۔ نامور علماء کی پوری ایک جمعیت سامنے تھی۔ ان حضرات کی مشکل کا اندازہ کیجیے۔ اگر صاف صاف طریق سے بیعت سے انکار کرتے ہیں تو ذبح ہوجاتے ہیں اور قبول کرتے ہیں تو ضمیر پر امرٹ داغ آتا ہے اور آئندہ کوئی کام کرنا ممکن نہیں رہتا۔ اس مجلسِ علماء میں امام ابوحنیفہ بھی موجود تھے (واضح رہے کہ امام کا مکہ سے کوفہ میں مستقل طور سے منتقل ہونا تو بعد کا واقعہ ہے۔ مولانا گیلانی کے بقول اس موقع پر اتفاقاً امام کی آمد ہوئی ہوگی) علماء کی خاموش نگاہیں امام کی طرف اٹھیں امام نے ان نگاہوں کو پڑھ کر خود ہی پیشکش کی کہ اگر آپ حضرات چاہیں تو میں اپنی طرف سے بھی اور آپ سب کی طرف سے بھی جواب عرض کروں۔ چنانچہ مجلس نے وکالت ونمائندگی کا فریضہ آپ کو سونپ دیا۔ امام نے تقریر کی اور تان اس بات پر توڑی کہ :-

" خدا کے حکم پر (علیٰ أمرِ اللهِ) ہم نے تمہاری بیعت کی اور اس بیعت کے ساتھ ہم قیام الساعۃ تک وفادار رہیں گے "

یہ انتہائی محتاط قانونی فقرہ امام نے حسنِ خطابت کے ایسے لطیف پردے میں پیش کیا کہ سفاح کی توجہ اس کی گہرائیوں تک نہ جاسکی بلکہ وہ تقریر کے مجموعی رنگ سے متاثر ہوگیا اور اس نے داد دی کہ علماء کی طرف سے تمہی جیسے آدمی کو خطاب کرنا چاہیئے تھا اور تم ہی اس کے

سزاوار تھے ۱؎

وقت کا یہ لمحہ جو سیفِ قاطع تھا، ٹل گیا۔ علماء باہر آئے تو امام سے سوال کیا کہ آپ نے یہ کیا بات کہی۔ انھوں نے بس اتنا ہی کہا کہ آپ نے بات میرے حوالے کی، بس میں نے اپنے لیے بھی ایک راہ نکالی اور آپ لوگوں کو بھی مصیبت سے بچا لیا۔ اس کے صاف معنی یہ تھے کہ امام کے مذکورہ بالا ذو معنیین فقرے کی گہرائی نے ان کے ساتھیوں میں سوال پیدا کر دیا۔ قطع نظر اس اہتمام کے کہ امام نے بیعت "امر اللہ" کی خاطر کی تھی، فقرے کا ایک پہلو دار جز "الٰی قیام الساعۃ" کے الفاظ تھے۔ "الٰی قیام الساعۃ" کا ایک ظاہری مفہوم یہ تھا کہ "قیامت کے قائم ہونے تک" ہم وفادار رہیں گے، اور السفاح کی نظر اسی مفہوم پر ٹھہر گئی۔ مگر "الٰی قیام الساعۃ" کا مفہوم متکلم نے کچھ اور پیشِ نظر رکھا، جبھی تو کہا کہ میں نے ایک راہ نکال لی۔ اس نکتے کو الکردری نے بھی لیا ہے اور کہا ہے کہ اس بات کی گنجائش ہے کہ امام ابو حنیفہ نے قیام الساعہ کے الفاظ سے مراد اس مجلس سے اٹھنے کا وقت لیا ہو۔ ۲؎ توریہ کا یہ نہایت حکیمانہ استعمال ہے جس کی گنجائش اسلام نے دی ہے۔ ہماری رائے میں اس سے بڑھ کر ایک مفہوم اور ان الفاظ سے ٹپکتا ہے، یعنی "وقت آنے تک" یا کسی ساعت خاص کے ظہور تک" سے مراد یہ ہو کہ جو نہی کہ ہم کوئی اقدام کرنے کے قابل ہو جائیں، اس مجبورانہ بیعت کو بالائے طاق رکھ دیں گے۔ امام کے اسلامی عزائم کا تصور سامنے رکھتے ہوئے یہ مفہوم

۱؎ مناقب، موفق۔ ج ۱، ص ۱۵۱، ۱۵۲۔ امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی — از مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم۔ ص ۱۴۷، ۱۴۸۔

۲؎ مناقب امام ابو حنیفہ — از کردری۔ ج ۱، ص ۲۰۰۔ امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی۔ از مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم۔ ص ۱۴۷، ۱۴۸۔

زیادہ قریب الفہم ہے۔

(۳) امام ابوحنیفہ کا نظریہ سیاسی یا فلسفہ انقلاب محض کسی سادہ سے جذباتی خارمولے پر مشتمل نہ تھا۔ سیاسی تبدیلی کی مہم اٹھانے کے لیے ان کے سامنے اسلام کے بعض محکم اصول اور لازمی شرائط تھے۔

زید بن علی اور ابراہیم بن میمون الصائغ کی امام صاحب نے قلبی، مالی اور لسانی اعانت بھی خوب کی، مگر بہ نفس نفیس عملاً خروج میں حصہ بھی نہیں لیا۔ اس کی وجہ مقصد میں اتفاق کے ساتھ ساتھ عملی اقدام میں وجہ اختلاف کا پایا جانا ہے۔ ایک طرف امام کا حال یہ تھا کہ ان دونوں حضرات کی تعریف کرتے تھے مقصد حق کے لیے اور ان کے جذبۂ کارکو بے حد سراہتے تھے۔ حتیٰ کہ زید بن علی کے بارے میں فرمایا کہ ان کا نکلنا حضورؐ کے بدر کو نکلنے کے مشابہ ہے[1] اور ابراہیم کے متعلق فتویٰ دیا کہ ابراہیم کی اعانت ورفاقت میں کام آجانا (کفار سے لڑنے کے لیے) مصیصہ کی چھاؤنی میں قیام کرنے سے بہتر ہے[2] بلکہ ان کے معرکے کو "بدرِ صغریٰ" قرار دیا[3]۔ زید کے متعلق تو یہاں تک فرماتے: "ان کے مرتبے کا آدمی دوسرا کوئی نہیں"[4] دونوں کی وفات ہونے پر جب بھی ان کی یاد آتی تو امام کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہو جاتا۔ پھر ان دونوں کو مالی مدد دینا اور ان کی رفاقت کے لیے لوگوں کو آمادہ کرنا بھی پیش نظر رہے۔ مگر بات عجیب لگتی ہے کہ ایک معرکہ لیسار انقلابی ہونے کے باوجود خود میدان میں نہیں اترے۔ اور اس کے لیے کسی مرض کا عذر۔

---

[1] حوالے پہلے درج ہو چکے ہیں۔

[2] تاریخ خطیب البغدادی ج ۱۳، ص ۳۴۶۔ ابن عساکر ج ۲، ص ۳۰۳۔ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی ص ۲۱۵

[3] تاریخ التقنافی الاسلام۔ از محمد بن محمود عزوی المغربی۔ ص ۴۷۔

[4] مقدمہ مسند الکبیر ص ۵۔

امانتوں کا عذر اور والدہ کی خدمت کا عذر بھی تاریخوں میں مذکور ہوا ہے مگر ان عذرات کے صحیح ہونے کے باوجود بات کچھ اور تھی۔ امام کے نہایت ہی پختہ نظریہ انقلاب کے مطابق بعض ضروری شرائط پوری نہیں ہوتی تھیں۔ اور کچے کام کے لیے امام کا ذہن تیار نہ ہو سکتا تھا۔

حضرت زید کی طرف سے نمائندہ بن کر فضیل بن زبیر کوفہ میں امام ابو حنیفہ سے ملے اور انہیں بیعت کی دعوت دی۔ اس پر امام نے یہ سوال کیا کہ زید کا رابطہ کن فقہاء سے ہے؟ مقصود یہ جاننا ہوگا کہ دینی اکابر میں سے کون ساتھ ہیں؟ بات چیت کے بعد حضرت زید کی اعانت کے لیے ایک رقم (ہزار ہزار روپیہ کی دس تھیلیاں) پیش کرتے ہوئے مطالبۂ بیعت کا جواب یہ دیا کہ اگر جانتا کہ لوگ (اہلِ کوفہ) راست باز ہیں اور وقت آنے پر ساتھ چھوڑ نہ دیں گے تو میں ضرور زید کی پیروی کرتا اور ان کے مخالفوں سے جہاد کرتا۔[1] یعنی امام کو اطمینان نہ تھا کہ زید کے ساتھ مخلص لوگوں کی کوئی ٹھوس جماعت ہے۔ زیدی تحریک کے اس کمزور پہلو کو اوروں نے بھی بروقت بھانپ لیا تھا، چنانچہ سلمہ بن کہیل نے مفصل مکالمہ کر کے حضرت زید کو بیعت کنندگان کے غدر کا اندیشہ دلایا اور باز رکھنا چاہا۔ کوفہ کے امام اعمش نے بھی یہی خطرہ ظاہر کیا۔ عبداللہ بن حسن نے حضرت زید کو خط لکھ کر متنبہ کیا کہ "ان (کوفیوں) کی زبانیں آگے آگے چلتی ہیں مگر ان کے دل ساتھ نہیں دیتے" اور "اگر چھوڑ دیئے جائیں تو گھسے پڑتے ہیں۔ لڑائے جائیں تو بزدلی دکھاتے ہیں اور کٹھن کام کے لیے بلائے جائیں تو اُلٹے پاؤں پھر جاتے ہیں۔" ذہبی نے لکھا تھا کہ کاش زید ہشام کے مقابلے کے لیے نہ نکلے ہوتے۔ گویا امام کو دوسرے اہلِ بصیرت کی طرح جہاں حضرت زید کی شخصیت پر اطمینان تھا وہاں ان کی جماعت پر بھروسہ نہ تھا۔ چنانچہ آخر الامر کوفی بیعت کنندگان

[1] ایضاً ص [illegible]

[2] امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی۔ ص ۷۸ تا ۹۰

نے بیوفائی کی۔

یہی صورت ابراہیم الصائغ کی تھی۔ ابراہیم نے امام کے سامنے دعوت رکھی، بحث کی اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ دونوں کے درمیان اس پر اتفاق تھا کہ یہ کام خدا کی طرف سے فرض ہے۔ (قولِ امام: "دعانی الی حق من حقوق اللّٰہ")۔ اس پر ابراہیم نے کہا کہ ہاتھ بڑھائیے تاکہ میں بعیت کر دوں۔ اس مطالبے کو قبول نہ کرتے ہوئے امام نے ایک تقریر کی اور کہا کہ اگر اس فرض کو ادا کرنے کے لیے دو ایک آدمی کھڑے ہونگے تو قتل کر دیئے جائیں گے اور خلقِ خدا کے لیے کوئی خاص کارِ خیر سرانجام نہ دے سکیں گے۔ اسی تقریر میں اپنے نظریۂ انقلاب کے شرائط (جس کی بنا کتاب و سنت پر ہے) کمال ایجاز سے بیان کر دیئے۔ ضروری نکات یہ ہیں:

— یہ فرض ہے مگر ایسا فرض نہیں کہ جس کے لیئے کوئی شخص تن تنہا اٹھ کھڑا ہو۔

— اس کے لیے ایسے مددگار درکار ہیں جو صالح ہوں (اعوانا صالحین)،

— ان کی قیادت کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں ہو جو اللہ کے دین پر (قابلِ اعتماد حد تک) استوار رہے۔

— یعنی ماحصل یہ کہ کسی مردِ صالح کی قیادت میں منظم طاقت وجود پذیر ہو[1]

اس نظریۂ انقلاب کی وجہ سے نہ تو آپ کو پورا اطمینان تھا کہ میدان میں اتر جانے اور نہ یہی گوارا تھا کہ تاریک ترین دورِ استبداد میں جو مردانِ کار اقامتِ دین کے مبارک مقصد کے لیے اٹھتے ہیں ان کی مساعی اکارت جائیں۔ بنا بریں ان سے بھرپور تعاون بھی کیا۔

(۴) امام ابوحنیفہ کی تیسری خوبی یہ تھی کہ "تخت یا تختہ" کے سادہ کلیہ کے مطابق

---

[1] امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی ص ۱۷۷ تا ۱۷۹

سوچنے اور کامیابی کی راہ نہ کھلے تو مخالف قوت سے سیدھے سیدھے ٹکرا جانے کے بجائے وہ ملے منصوبے پر میدانِ کار اور طریقِ کار کو بدل بدل کر کام کر سکتے تھے۔ اسلامی تاریخ کے داعیانِ حق کی صفوں میں بکثرت ایسے انقلابی ملتے ہیں جنہوں نے ایک نقشہ پر کام کیا اور پھر اگر کامرانی کا دروازہ نہیں کھلا تو انہوں نے نقشۂ کار کو بدلنے کے بجائے سیدھے آگے ہی آگے قدم بڑھا کر اپنے آپ کو دیوارِ مزاحمت سے ٹکرا دیا۔ جس کی اوّلین نظیر حضرت امام حسینؓ نے قائم کی۔ وہ نمونہ اپنی جگہ بے حد قیمتی ہے۔ مگر امام ابوحنیفہ کا پیش کردہ دوسرا نمونہ بھی بے حد قیمتی ہے۔

کسی انقلابی کا کلمۂ حق کہہ کر سلطانِ جابر کی تیغِ ظلم کا شکار ہو جانے میں جہاں خیر و برکت کا یہ پہلو تھا کہ معاشرے میں جذبۂ احیائے اسلام متحرک ہوتا تھا اور احساس سُن نہیں ہونے پاتا تھا، وہاں اس کا دوسرا اثر بعض حالات میں یہ بھی ہوتا تھا کہ عوام پر خوف سے کپکپی طاری ہو جاتی۔ اور تبدیلی کے امکان ہی سے مایوسی ہو جاتی۔ امام ابوحنیفہ کی نظر دونوں جانب رہی۔ ان کا قول بہ روایت علامہ ابوبکر الجصاص یہ تھا کہ:

> "اپنے آپ کو جابرہ سے ٹکرا کر قتل کرا دینے میں ایک اور مصلحت بھی مانع ہے۔ وہ یہ کہ اس قتل کے بعد اندیشہ ہے کہ دوسروں کے حوصلے بھی باطل کے مقابلے میں پست ہو جائیں گے"[1]

یعنی ان پہلوؤں کو جانچ تول کر ہی کوئی اقدام کیا جا سکتا ہے۔ ایک ایسا داعی جس کے سامنے قطعی طور پر بے حس معاشرہ ہو اور کام کرنے کا سرے سے کوئی میدان نہ مل رہا ہو تو پھر ظلم کی قوت سے ٹکر لے کر تاریخ میں تموّج پیدا کرنا افضل الجہاد ہے۔ لیکن اگر معاشرہ کے حالات بالکل تاریک نہ ہو گئے ہوں، اس میں قلوبِ حساس باقی ہوں اور کام کرنے کا

---

[1] احکام القرآن از جصاص ج ۲ ص ۳۲۔ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی از مولانا مناظر احسن گیلانیؒ ص ۱۸۱

ایک یا دوسرا یا تیسرا میدان مل سکتا ہو تو پھر فیصلہ کن تصادم سے بچ کر کام کا تسلسل کسی نہ کسی شکل میں باقی رکھنا ہی صحیح طریق کار ہے۔ امام نے اسی پر عمل کیا۔

حضرت امام نے ایک طرف اقتدار کا آلۂ کار بننے سے اپنے آپ کو شدید آزمائش سے گذر کر بھی بچایا، دوسری طرف زیر زمین کام کر کے حکومت کے تخت کو الٹنے والی تحریک کا ساتھ دیا، اور جب ان منفی اور مثبت دو گونہ مساعی سے بھی گوہر مراد ہاتھ نہیں آیا تو نہ تو ہمت ہار کر اپنے مقصد سے روگردانی کی اور نہ اپنے آپ کو اقتدار سے ٹکرا کر یکبارگی کھیل ختم کیا بلکہ حصول مقصد کے لیے نئی راہ نکالی اور نیا طریق کار وضع کر لیا۔ وہ کام جسے آج ہم تدوینِ فقہ کا عنوان دیتے ہیں، درحقیقت امام نے اپنے اسی مشن کی تکمیل کے لیے ہاتھ میں لیا جسے وہ براہِ راست سیاسی میدان میں حاصل نہ کر سکے تھے۔ انھوں نے اپنے مقصد کو گویا مستقبل تک پھیلا دیا اور آئندہ نسلوں کو شریکِ کار کرنے کی ٹھانی۔ انھوں نے سرزمین علم میں انقلاب کی تخم ریزی کے لیے کسان کی سی لمبی صبر آزما محنت کا بالکل نئے سرے سے آغاز کیا۔ انہوں نے ایک فکری محاذ برپا کرنے کا ارادہ باندھ لیا اور پھر اسی مہم میں مصروف ہو گئے۔

ایک ضروری اعلان

ہم نے اس امر کا اہتمام کیا ہے کہ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، مکتبہ چراغ راہ، مکتبہ تعمیر انسانیت اور دوسرے اسلامی لٹریچر شائع کرنے والے اداروں کی کتب دفتر ترجمان القرآن سے بھی ضرورت مند حضرات کو مل سکیں۔ قارئین کرام اپنی ضرورت کے مطابق آرڈر بھیج سکتے ہیں۔

منیجر شعبہ کتب ادارہ ترجمان القرآن

اچھرہ لاہور

رسائل و مسائل

موجودہ سائنسی دور میں اسلامی جہاد کی کیفیت

سوال۔ مسلمانوں کے جذبۂ "جہاد" کو زندہ رکھنے کے لیے آج بیسویں صدی میں کیا طریق کار اختیار کیا جائے گا جبکہ آج کی جنگ شمشیر و سناں سے یا میدان جنگ میں صف آرا ہو کر دست بدست نبرد آزمائی سے نہیں ہوتی بلکہ سائنسی ہتھیاروں، جنگی چالوں STRATEGY اور جاسوسی ESPIONAGE سے لڑی جاتی ہے؟ آپ ایٹم بم، راکٹ، میزائل اور مشینی ایجادات وغیرہ کا سہارا لے کر اس سائنسی و ایٹمی دور میں "جہاد" کی تشریح کس طرح کریں گے؟ کیا چاند، مریخ و مشتری پر اترنے اور سٹلائیٹ چھوڑنے یا فضا میں راکٹ سے پرواز کرنے اور نت نئی ایجادات کرنے والے مجاہدین کے زمرے میں آسکتے ہیں؟ ..... انتظامی امور اور ملکی نظام (CIVIL ADMINISTRATION) میں فوج کو کیا مقام دیا جا سکتا ہے؟ موجودہ دور کے فوجی انقلابات سے ملکی نظام میں فوج کی شمولیت اور افادیت بہت حد تک ثابت ہو چکی ہے۔ کیوں نہ فوج کو دورِ امن میں بٹھا کر کھلانے کے بجائے ہر میدان میں قوم کی خدمت سپرد ہو؟

جواب۔ جہاد کے متعلق اولین بات یہ سمجھ لینی چاہیے کہ جہاد اور لڑاکا پن میں بہت فرق ہے۔ اسی طرح قومی اغراض کے لیے جہاد اور چیز ہے اور جہاد فی سبیل اللہ اور چیز۔ مسلمانوں میں جس جذبۂ جہاد کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے وہ اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک ان کے اندر ایمان ترقی کرتے کرتے اس حد تک نہ پہنچ جائے کہ وہ خدا کی زمین سے برائیوں کو

تمام لوگ اس زمین میں خدا کا کلمہ بلند کرنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار نہ ہو جائیں اور دوسری طرف ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ سب کچھ اس جذبے کی جڑ کاٹ دینے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ تعلیم وہ دی جا رہی ہے جو ایمان کے بجائے شک اور انکار پیدا کرے۔ تربیت وہ دی جا رہی ہے جس سے افراد میں اور سوسائٹی میں وہ برائیاں پھیلیں جنہیں ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلام کے نزدیک برائیاں ہیں۔ اس کے بعد یہ سوال لاحاصل ہے کہ مسلمانوں میں جذبہ جہاد کیسے پیدا ہوگا۔ موجودہ حالت میں یا تو مسلمان کرائے کا سپاہی (MERCENARY) بنے گا یا حد سے حد قومی اغراض کے لیے لڑے گا۔ رہے سائنسی ہتھیار اور جنگی چالیں (STRATEGY) تو یہ وہ اسباب ہیں جو جائز اغراض اور ناجائز اغراض سب کے لیے استعمال ہو سکتے ہیں۔ اگر مسلمان میں سچا ایمان موجود ہو اور اسلام کا نصب العین اس کا اپنا نصب العین بن جائے تو وہ پورے جذبے کے ساتھ تمام وہ قابلیتیں اپنے اندر پیدا کرے گا جو اس زمانے میں لڑنے کے لیے درکار ہیں اور تمام وہ ذرائع اور وسائل فراہم کرے گا جو آج یا آئندہ جنگ کے لیے درکار ہوں۔

چاند اور مریخ اور مشتری پر اترنا اپنی نوعیت کے لحاظ سے کولمبس کے امریکہ پر اترنے اور واسکوڈی گاما کے جزائر شرق الہند پر اترنے سے زیادہ مختلف نہیں۔ اگر یہ لوگ مجاہد فی سبیل اللہ مانے جا سکتے ہیں تو چاند اور مریخ پر اترنے والے بھی مجاہدین بن جائیں گے۔

انتظامی امور اور مملکتی نظام (CIVIL ADMINISTRATION) میں فوج کا داخل ہونا فوج کے لیے بھی اور ملک کے لیے بھی سخت تباہ کن ہے۔ فوج بیرونی دشمنوں سے ملک کی حفاظت کرنے کے لیے منظم کی جاتی ہے۔ ملک پر حکومت کرنے کے لیے منظم نہیں کی جاتی۔ اس کو تربیت دشمنوں سے لڑنے کی دی جاتی ہے۔ اس تربیت سے پیدا ہونے والے اوصاف خود اپنے ملک کے باشندوں سے معاملہ کرنے کے لیے موزوں نہیں ہوتے۔ علاوہ بریں ملکی معاملات کو جو لوگ بھی چلائیں خواہ وہ سیاست کار (POLITICIAN)

ہوں یا ملکی نظم و نسق کے منتظم (CIVIL ADMINISTRATORS) ان کے کام کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے کہ ملک میں بہت سے لوگ ان سے خوش بھی ہوتے ہیں اور ناراض بھی۔ فوج کا اس میدان میں اترنا لامحالہ فوج کو غیر ہر دلعزیز (UNPOPULAR) بنانے کا موجب ہوتا ہے۔ حالانکہ فوج کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ سارے ملک کے باشندے اس کی پشت پر ہوں اور جنگ کے موقع پر ملک کا ہر فرد اس کی مدد کرنے کے لیے تیار رہے۔ دنیا میں زمانہ حال کے فوجی انقلابات نے ملکی نظام میں فوج کی شمولیت کو مفید ثابت نہیں کیا ہے بلکہ درحقیقت تجربے نے اس کے برے نتائج ظاہر کر دیے ہیں۔

اسلامی حکومت میں خواتین کا دائرہ عمل

سوال۔ کیا اس دور میں اسلامی حکومت خواتین کو مردوں کے برابر سیاسی، معاشی و معاشرتی حقوق ادا نہ کرے گی جبکہ اسلام کا دعویٰ ہے کہ اس نے تاریک ترین دور میں بھی عورت کو ایک مقام (STATUS) دیا؟ کیا آج خواتین کو مردوں کے برابر اپنے ورثہ کا حصہ لینے کا حق دیا جا سکتا ہے؟ کیا ان کو اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم یا مردوں کے شانہ بشانہ کام کر کے ملک و قوم کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کی اجازت نہ ہوگی؟ فرض کیجیے اگر اسلامی حکومت خواتین کو برابر کا حق رائے دہندگی دے اور وہ کثرت آراء سے وزارت و صدارت کے عہدوں کے لیے الیکشن لڑ کر کامیاب ہو جائیں تو موجودہ بیسویں صدی میں بھی کیا ان کو منصب اعلیٰ کا حق اسلامی احکام کی رو سے نہیں مل سکتا جبکہ بہت سی مثالیں ابھی آج موجود ہیں۔ مثلاً سیلون میں صدارت عظمیٰ ایک عورت کے پاس ہے یا نیدرلینڈ میں ایک خاتون ہی حکمران اعلیٰ ہے۔ برطانیہ پر ملکہ کی

شہنشاہیت ہے۔ سفارتی حد تک جیسے عابدہ سلطانہ دختر نواب آف بھوپال رہ چکی ہیں اور اب بیگم رعنا لیاقت علی خان نیدرلینڈ میں سفیر ہیں۔ یا دیگر جس طرح مسز وجے لکشمی پنڈت برطانیہ میں ہائی کمشنر ہیں اور اقوام متحدہ کی صدر رہ چکی ہیں۔ اور بھی مثالیں جیسے نور جہاں، جھانسی کی رانی، رضیہ سلطانہ، حضرت محل زوجہ واجد علی شاہ جو کہ PRIDE OF WOMAN کہلاتی ہیں جنہوں نے انگریزوں کے خلاف لکھنؤ میں جنگ کی کمانڈ کی۔ اس طرح خواتین نے خود کو پورا اہل ثابت کر دیا ہے۔ تو کیا اگر آج محترمہ فاطمہ جناح صدارت کا عہدہ سنبھال لیں تو اسلامی اصول پاکستان کے اسلامی نظام میں اس کی اجازت نہ دیں گے؟ کیا آج بھی خواتین کو ڈاکٹر، وکلاء، مجسٹریٹ، جج، فوجی افسر یا پائیلٹ وغیرہ بننے کی مطلق اجازت نہ ہو گی؟ . . . خواتین کا یہ بھی کارنامہ کہ وہ نرسوں کی حیثیت سے کس طرح مریضوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں قابلِ ذکر ہے۔ خود اسلام کی پہلی جنگ میں خواتین نے مجاہدین کی مرہم پٹی کی، پانی پلایا اور حوصلے بلند کیے۔ تو کیا آج بھی اسلامی حکومت میں آدھی قوم کو مکانات کی چاردیواری میں مقید رکھا جائے گا؟

جواب - اسلامی حکومت دنیا کے کسی معاملے میں بھی اسلامی اصولوں سے ہٹ کر کوئی کام کرنے کی نہ تو مجاز ہے اور نہ وہ اس کا ارادہ ہی کر سکتی ہے، اگر فی الواقع اس کو چلانے والے ایسے لوگ ہوں جو اسلام کے اصولوں کو سچے دل سے مانتے ہوں اور اسی پر عمل کرتے ہوں۔ عورتوں کے معاملے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ عورت اور مرد عزت و احترام کے لحاظ سے برابر ہیں۔ اخلاقی معیار کے لحاظ سے بھی برابر ہیں۔ آخرت میں اپنے اجر کے لحاظ سے بھی برابر ہیں۔ لیکن دونوں کا دائرہ عمل ایک نہیں ہے۔ سیاست اور ملکی انتظام اور فوجی خدمات اور اسی طرح کے دوسرے کام مرد کے دائرہ عمل سے تعلق رکھتے ہیں۔

اِس دائرے میں عورت کو گھسیٹ لانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو ہماری خانگی زندگی بالکل تباہ ہو جائے گی جس کی بیشتر ذمہ داریاں عورتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ یا پھر عورتوں پر دُہرا بار ڈالا جائے گا کہ وہ اپنے فطری فرائض بھی انجام دیں جن میں مرد قطعاً شریک نہیں ہو سکتا اور پھر مرد کے فرائض کا بھی نصف حصہ اپنے اوپر اٹھائیں عملاً یہ دوسری صورت ممکن نہیں ہے۔ لازماً پہلی صورت ہی رونما ہوگی اور مغربی ممالک کا تجربہ بتاتا ہے کہ وہ رونما ہو چکی ہے۔ آنکھیں بند کر کے دوسروں کی حماقتوں کی نقل اتارنا عقل مندی نہیں ہے۔

اسلام میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وراثت میں عورت کا حصہ مرد کے برابر ہو۔ اس باب میں قرآن کا صریح حکم مانع ہے۔ نیز یہ انصاف کے بھی خلاف ہے کہ عورت کا حصہ مرد کے برابر ہو۔ کیونکہ اسلامی احکام کی رُو سے خاندان کی پرورش کا سارا مالی بار مرد پر ڈالا گیا ہے۔ بیوی کا مہر اور نفقہ بھی اس پر واجب ہے۔ اس کے مقابلہ میں عورت پر کوئی مالی بار نہیں ڈالا گیا ہے۔ اس صورت میں آخر عورت کو مرد کے برابر حصہ کیسے دلایا جا سکتا ہے؟

اسلام اصولاً مخلوط سوسائٹی کا مخالف ہے اور کوئی ایسا نظام جو خاندان کے استحکام کو اہمیت دیتا ہو اس کو پسند نہیں کرتا کہ عورتوں اور مردوں کی مخلوط سوسائٹی ہو۔ مغربی ممالک میں اس کے بدترین نتائج ظاہر ہو چکے ہیں۔ اگر ہمارے ملک کے لوگ ان نتائج کو بھگتنے کے لیے تیار رہوں تو شوق سے بھگتتے رہیں لیکن آخر یہ کیا ضروری ہے کہ اسلام میں اُن افعال کی گنجائش زبردستی نکالی جائے جن سے وہ شدت کے ساتھ روکتا ہے۔

اسلام میں اگر جنگ کے موقع پر عورتوں سے مرہم پٹی کا کام لیا گیا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ امن کی حالت میں عورتوں کو دفتروں اور کارخانوں اور کلبوں اور پارلیمنٹوں میں لا کھڑا کیا جائے۔ مرد کے دائرۂ عمل میں آ کر عورتیں کبھی مردوں کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے کہ وہ ان کاموں کے لیے بنائی ہی نہیں گئی ہیں۔ ان کاموں کے لیے جن

اخلاقی اور ذہنی اوصاف کی ضرورت ہے وہ دراصل مرد میں پیدا کیے گئے ہیں عورت مصنوعی طور پر مرد بن کر کچھ تھوڑا بہت ان اوصاف کو اپنے اندر ابھارنے کی کوشش کرے بھی تو اس کا دہرا نقصان خود اس کو بھی ہوتا ہے اور معاشرہ کو بھی۔ اس کا اپنا نقصان یہ ہے کہ وہ نہ پوری عورت رہتی ہے، نہ پوری مرد بن سکتی ہے اور اپنے اصلی دائرہ عمل میں جس کے لیے وہ فطرتاً پیدا کی گئی ہے ناکام رہ جاتی ہے۔ معاشرہ اور ریاست کا نقصان یہ ہے کہ وہ اہل کارکنوں کے بجائے نااہل کارکنوں سے کام لیتا ہے اور عورت کی آدھی زنانہ اور آدھی مردانہ خصوصیات سیاست اور معیشت کو خراب کر کے رکھ دیتی ہیں۔ اس سلسلہ میں گنتی کی چند سابقہ معروف خواتین کے نام گنانے سے کیا فائدہ۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ جہاں لاکھوں کارکنوں کی ضرورت ہو کیا وہاں تمام خواتین موزوں ہو سکیں گی؟ ابھی حال ہی میں مصر کے سرکاری محکموں اور تجارتی اداروں نے یہ شکایت کی ہے کہ وہاں بحیثیت مجموعی ایک لاکھ دس ہزار خواتین جو مختلف مناصب پر کام کر رہی ہیں بالعموم ناموزوں ثابت ہو رہی ہیں اور ان کی کارکردگی مردوں کی بہ نسبت ۵ فیصدی سے زیادہ نہیں۔ پھر مصر کے تجارتی اداروں نے یہ عام شکایت کی ہے کہ عورتوں کے پاس پہنچ کر کوئی راز، راز نہیں رہتا۔ مغربی ممالک میں جاسوسی کے جتنے واقعات پیش آتے ہیں ان میں بھی عموماً کسی نہ کسی طرح عورت کا دخل ہوتا ہے۔

عورتوں کی تعلیم سے اسلام ہرگز نہیں روکتا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم ان کو دلوائی جانی چاہیے لیکن چند شرطوں کے ساتھ۔ اول یہ کہ ان کو وہ تعلیم خاص طور پر دی جائے جس سے وہ اپنے دائرہ عمل میں کام کرنے کے لیے ٹھیک ٹھیک تیار ہو سکیں اور ان کی تعلیم بعینہٖ وہ نہ ہو جو مردوں کی ہو۔ دوسرے یہ کہ تعلیم مخلوط نہ ہو اور عورتوں کو زنانہ تعلیم گاہوں میں عورتوں ہی سے تعلیم دلوائی جائے۔ مخلوط تعلیم کے مہلک نتائج مغربی ترقی یافتہ ممالک میں اس حد تک سامنے آ چکے ہیں کہ اب صرف عقل کے اندھے ہی ان کا انکار کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھیے امریکہ میں ۱۷ سال تک عمر کی لڑکیاں جو ہائی سکولوں میں پڑھتی ہیں مخلوط تعلیم کی وجہ سے ہر سال

ان میں سے اوسطاً ایک ہزار حاملہ نکلتی ہیں۔ گو ابھی یہ شکل ہمارے ہاں رونما نہیں ہوئی ہے لیکن اس مخلوط تعلیم کے نتائج کچھ ہمارے سامنے بھی آنے شروع ہو گئے ہیں۔ تیسرے یہ کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین سے ایسے اداروں میں کام لیا جائے جو صرف عورتوں کے لیے ہی مخصوص ہوں مثلاً زنانہ تعلیم گاہیں، اور زنانہ ہسپتال وغیرہ۔

اسلامی حکومت میں معاشرہ کی اصلاح و تربیت

سوال۔ کیا اسلامی حکومت خواتین کی بڑھتی ہوئی آزادی کو سختی سے روکے گی؟ جیسے ان کی زیبائش اور نیم عریاں لباس زیب تن کرنے اور فیشن کا رجحان۔ اور جیسے آج کل نوجوان لڑکیاں نہایت تنگ و دلفریب سنٹ سے معطر لباس اور غازہ و سرخی سے مزین اپنے ہر خدوخال اور نشیب و فراز کی نمائش برسرِ عام کرتی ہیں اور آج کل نوجوان لڑکے بھی ہالی وڈ فلموں سے متاثر ہو کر ٹیڈی بوائز بن رہے ہیں۔ تو کیا حکومت قانون (LEGISLATION) کے ذریعہ سے ہر مسلم و غیر مسلم لڑکے اور لڑکی کے آزادانہ رجحان کو روکے گی؟ خلاف ورزی پر سزا دیگی؟ والدین و سرپرستوں کو جرمانہ کیا جاسکے گا؟ تو اس طرح کیا ان کی شہری آزادی پہ ضرب نہ لگے گی؟ ـــــــ کیا گرلز گائیڈ۔ اپوا (APWA) یا دیگر وائی ایم سی۔ اے (YMCA) اور وائی ڈبلیو سی اے (YWCA) جیسے ادارے اسلامی نظام میں گوارا کیے جاسکتے ہیں؟ کیا خواتین خواہ اسلامی عدلیہ سے ہی سہی خود طلاق لینے کی مجاز ہو سکیں گی اور مردوں پہ ایک سے زیادہ شادی کی پابندی آج جائز ہوگی؟ یا خواہ اسلامی عدالت کے روبرو ہی ان کو اپنی پسند سے CIVIL MARRIAGE کرنے کا حق حاصل ہو سکتا ہے؟ کیا خواتین کو

یوتھ فیسٹیول، کھیلوں، نمائش، ڈراموں، ناچ، فلموں یا مقابلہ حسن میں شرکت یا AIR HOSTESS وغیرہ بننے کی آج بھی اسلامی حکومت مخالفت کرے گی؟ ساتھ ہی قومی کردار تباہ کرنے والے ادارے مثلاً سینما، فلمیں۔ ٹیلی ویژن ریڈیو پر فحش گانے وعریاں رسائل ولٹریچر، موسیقی، ناچ ورنگ کی ثقافتی محفلیں وغیرہ کو بند کر دیا جائے گا یا فائدہ اٹھانا ممکن ہو گا؟

جواب: اسلام معاشرہ کی اصلاح و تربیت کا سارا کام محض قانون کے ڈنڈے سے نہیں لیتا۔ تعلیم، نشر و اشاعت اور رائے عام کا دباؤ اس کے ذرائع اصلاح میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان تمام ذرائع کے استعمال کے بعد اگر کوئی خرابی باقی رہ جائے تو اسلام قانونی وسائل اور انتظامی تدابیر استعمال کرنے میں بھی تامل نہیں کرتا۔ عورتوں کی عریانی اور بے حیائی فی الواقع ایک بہت بڑی بیماری ہے جسے کوئی سچی اسلامی حکومت برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ بیماری اگر دوسری تدابیرِ اصلاح سے درست نہ ہو یا اس کا وجود باقی رہ جائے تو یقیناً اس کو از روئے قانون روکنا پڑے گا۔ اس کا نام اگر شہری آزادی پر ضرب لگانا ہے تو جواریوں کو پکڑنا اور جیب کتروں کو سزائیں دینا بھی شہری آزادی پر ضرب لگانے کے مترادف ہے۔ اجتماعی زندگی لازماً افراد پر کچھ پابندیاں عائد کرتی ہے۔ افراد کو اس کے لیے آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا کہ وہ اپنے ذاتی رجحانات اور دوسروں سے سیکھی ہوئی برائیوں سے اپنے معاشرہ کو خراب کریں۔

گرلز گائیڈز (GIRL GUIDES) کے لیے اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔ اپوا (APWA) قائم رہ سکتی ہے بشرطیکہ وہ اپنے دائرہ عمل میں رہ کر کام کرے اور قرآن کا نام لے کر قرآن کے خلاف طریقے استعمال کرنا چھوڑ دے۔ YWCA عیسائی عورتوں کے لیے رہ سکتا ہے مگر کسی مسلمان عورت کو اس میں گھسنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ مسلمان عورتیں چاہیں تو YWMA بنا سکتی ہیں، بشرطیکہ وہ اسلامی حدود میں رہیں

مسلمان عورت اسلامی عدلیہ کے ذریعہ سے خلع حاصل کر سکتی ہے۔ فسخ نکاح (NULLIFICATION) اور تفریق (JUDICIAL SEPARATION) کی ڈگری بھی عدالت سے حاصل کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ شریعت کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ان میں سے کوئی ڈگری عدالت سے حاصل کرنے کی مجاز ہو۔ لیکن طلاق (DIVORCE) کے اختیارات، قرآن نے صریح الفاظ میں صرف مرد کو دیے ہیں اور کوئی قانون مردوں کے اس اختیار میں مداخلت نہیں کر سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ قرآن کا نام لے کر قرآن کے خلاف قوانین بنائے جانے لگیں۔ پوری اسلامی تاریخ عہدِ رسالت سے لے کر اس صدی تک اس تصور سے ناآشنا ہے کہ طلاق دینے کا اختیار مرد سے سلب کر لیا جائے اور کوئی عدالت یا پنچایت اس میں دخل دے۔ یہ تخیل سیدھا یورپ سے چل کر ہمارے ہاں درآمد ہوا ہے اور اس کے درآمد کرنے والوں نے کبھی آنکھیں کھول کر یہ نہیں دیکھا ہے کہ یورپ میں اس قانون طلاق کا پس منظر (BACK GROUND) کیا ہے اور وہاں اس کے کتنے بُرے نتائج رونما ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں جب گھروں کے سکینڈل نکل کر بازاروں میں پہنچیں گے تو لوگوں کو پتہ چلے گا کہ خدا کے قوانین میں ترمیم کے کیا نتائج ہوتے ہیں۔

مردوں پر ایک سے زیادہ شادی کے معاملہ میں از روئے قانون پابندی عائد کرنے کا یا اس میں رکاوٹ ڈالنے کا تخیل بھی ایک بیرونی مال ہے جسے قرآن کے جعلی پرمٹ پر درآمد کیا گیا ہے۔ یہ اُس سوسائٹی میں سے آیا ہے جس میں ایک ہی عورت اگر منکوحہ بیوی کی موجودگی میں داشتہ کے طور پر رکھی جائے تو نہ صرف یہ کہ وہ قابلِ برداشت ہے بلکہ اس کے حرامی بچوں کے حقوق محفوظ کرنے کی بھی فکر کی جاتی ہے۔ (فرانس کی مثال ہمارے سامنے ہے) لیکن اگر اسی عورت سے نکاح کر لیا جائے تو یہ جرم ہے۔ گویا ساری پابندیاں حلال کے لیے ہیں حرام کے لیے نہیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن مجید کی ابجد سے بھی واقف ہو تو کیا وہ یہ اقدار (VALUES) اختیار کر سکتا ہے؟ کیا اس کے نزدیک زنا قانوناً جائز

اور نکاح قانوناً حرام ہونے کا عجیب و غریب فلسفہ برحق ہو سکتا ہے؟ اس طرح کے قوانین بنانے کا حاصل اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ مسلمانوں میں زنا کا رواج بڑھے گا۔ گرلز فرینڈز اور داشتائیں (MISTRESSES) فروغ پائیں گی اور دوسری بیوی ناپید ہو جائے گی۔ یہ ایک ایسی سوسائٹی ہو گی جو اپنے خد و خال میں اسلام کی اصل سوسائٹی سے بہت دور اور مغربی سوسائٹی سے بہت قریب ہو گی۔ اس صورتِ حال کے تصور سے جس کا جی چاہے مطمئن ہو، مسلمان کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔

سول میرج کا سوال ظاہر ہے کہ مسلمان عورت کے ساتھ تو پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سوال اگر پیدا ہوتا ہے تو کسی مشرک عورت سے شادی کرنے کے معاملہ میں، یا کسی ایسی عیسائی یا یہودی عورت سے شادی کے معاملہ میں جو اسلامی قانون کے تحت کسی مسلمان سے نکاح کرنے کے لیے تیار نہ ہو اور مسلمان مرد اس کے عشق میں مبتلا ہو کر اس اقرار کے ساتھ شادی کرے کہ وہ کسی مذہب کا پابند نہ ہوگا۔ یہ کام اگر کسی کو کرنا ہی ہو تو اسے اسلام سے فتویٰ لینے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اسلام کیوں اپنے ایک پیرو کو اس کی اجازت دے؟ اور ایک اسلامی عدالت کا یہ کام کب ہے کہ مسلمانوں کی اس طریقہ پر شادیاں کروائے؟

اگر ایک اسلامی حکومت بھی یوتھ فیسٹیول YOUTH FESTIVAL اور کھیلوں کی نمائشوں اور ڈراموں اور رقص و سرود اور مقابلۂ حسن میں مسلمان عورتوں کو لائے یا ایر ہوسٹس AIR HOSTESS بنا کر مسافروں کے دل موہنے کی خدمت اس سے لے تو ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اسلامی حکومت کی آخر ضرورت کیا ہے؟ یہ سارے کام تو کفر اور کفار کی حکومت میں بآسانی ہو سکتے ہیں بلکہ زیادہ آزادی کے ساتھ ہو سکتے ہیں۔

سینما، فلم، ٹیلی ویژن اور ریڈیو وغیرہ تو خدا کی پیدا کردہ طاقتیں ہیں جن میں بجائے خود کوئی خرابی نہیں۔ خرابی اُن کے اُس استعمال میں ہے جو انسانی اخلاق کو تباہ کرنے والا ہے۔ اسلامی حکومت کا کام ہی یہ ہے کہ وہ ان ذرائع کو انسانیت کی فلاح کے لیے استعمال

کرنے اور اخلاقی فساد کے لیے استعمال ہونے کا دروازہ بند کر دے۔

ضبطِ ولادت اور وصیۃ العینین کی شرعی حیثیت

سوال: دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے آج اسلام کیا حل پیش کرتا ہے؟ برتھ کنٹرول (پیدائش روکنے) کے لیے دواؤں کا استعمال، فیملی پلاننگ وغیرہ کو کیا آج بھی غیر شرعی قرار دے کر ممنوع قرار دیا جائے گا؟ کیا ایک مسلمان زندگی میں اپنی آنکھیں عطیہ کر سکتا ہے کہ موت کے بعد کسی مریض کے لیے استعمال ہو سکیں؟ کیا یہ قربانی گناہ تو نہ ہوگی اور قیامت میں یہ شخص اندھا تو نہ اٹھے گا؟

جواب۔ دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے اسلام صرف ایک ہی حل پیش کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا نے اپنے رزق کے جو ذرائع پیدا کیے ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ ڈھلنے اور استعمال کرنے کی کوشش کی جاتی رہے اور جو ذرائع اب تک مخفی ہیں ان کو دریافت کرنے کی پیہم سعی کی جاتی رہے۔ آبادی روکنے کی ہر کوشش خواہ وہ قتلِ اولاد ہو یا استقاطِ حمل یا منعِ حمل، غلط اور بے حد تباہ کن ہے۔ ضبطِ ولادت کی تحریک کے چار نتائج ایسے ہیں جن کو رونما ہونے سے کسی طرح نہیں روکا جا سکتا۔

(۱) زنا کی کثرت

(۲) انسان کے اندر خود غرضی اور اپنا معیارِ زندگی بڑھانے کی خواہش کا اس حد تک ترقی کر جانا کہ اسے اپنے بوڑھے ماں باپ اور اپنے یتیم بھائیوں اور اپنے دوسرے محتاج امداد رشتہ داروں کا وجود بھی ناگوار گزرنے لگے۔ کیونکہ جو آدمی اپنی روٹی میں خود اپنی اولاد کو شریک کرنے کے لیے تیار نہ ہو وہ دوسروں کو بھلا کیسے شریک کر سکے گا۔

(۳) آبادی کے اضافے کا کم سے کم مطلوب معیار بھی جو ایک قوم کو زندہ رکھنے کے

لیے ناگزیر ہے برقرار نہ رہنا، اس لیے کہ جب یہ فیصلہ کرنے والے افراد ہوں گے کہ وہ کتنے بچے پیدا کریں اور کتنے نہ کریں اور اس فیصلہ کا مدار اس بات پر ہوگا کہ وہ اپنے معیارِ زندگی کو نئے بچوں کی آمد کی وجہ سے گرنے نہ دیں تو بالآخر وہ اتنے بچے بھی پیدا کرنے کے لیے تیار نہ ہوں گے جتنے ایک قوم کو اپنی قومی آبادی برقرار رکھنے کے لیے درکار ہوتے ہیں۔ اس طرح کے حالات میں کبھی کبھی نوبت یہ بھی آجاتی ہے کہ شرح پیدائش شرح اموات سے کمتر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ نتیجہ فرانس دیکھ چکا ہے حتیٰ کہ اس کو "بچے زیادہ پیدا کرو" کی تحریک چلانی پڑی اور انعامات کے ذریعہ سے اس کی ہمت افزائی کرنے کی ضرورت پیش آگئی۔

(۴) قومی دفاع کا کمزور ہو جانا۔ یہ نتیجہ خصوصی طور پر کسی ایسی قوم کے لیے بے حد خطرناک ہے جو اپنے سے تیرہ گنی زیادہ دشمن آبادی میں گھرا ہوا ہو۔ پاکستان کے تعلقات ہندوستان و افغانستان کے ساتھ جیسے کچھ ہیں سب کو معلوم ہے۔ اور امریکہ کی دوستی نے کمیونسٹ ممالک سے بھی اس کے تعلقات خراب کر دیئے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ہندوستان، چین، روس اور افغانستان کی آبادی ہم سے تیرہ گنی ہے۔ ان حالات میں لڑنے کے قابل افراد کی تعداد گھٹانا جیسی کچھ عقل مندی ہے اسے ایک صاحب عقل آدمی خود سوچ سکتا ہے۔

آنکھوں کے عطیے کا معاملہ صرف آنکھوں تک ہی محدود نہیں رہتا بہت سے دوسرے اعضا بھی مریضوں کے کام آسکتے ہیں اور ان کے دوسرے مفید استعمال بھی ہو سکتے ہیں یہ دروازہ اگر کھول دیا جائے تو مسلمان کا قبر میں دفن ہونا مشکل ہو جائے گا۔ اس کا سارا جسم ہی چندے میں تقسیم ہو کر رہ جائے گا۔ اسلامی نظریہ یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے جسم کا مالک نہیں ہے۔ اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ مرنے سے پہلے اپنے جسم کو تقسیم کرنے یا چندہ میں دینے کی وصیت کر دے۔ جسم اس وقت تک اس کے تصرف میں ہے جب تک وہ اس جسم میں خود رہتا ہے۔ اس کے نکل جانے کے بعد اس جسم پر اس کا کوئی حق

نہیں ہے کہ اس کے معاملے میں اس کی وصیت نافذ ہو۔ اسلامی احکام کی رُو سے یہ زندہ انسانوں کا فرض ہے کہ اُس کا جسم احترام کے ساتھ دفن کر دیں۔

اسلام نے انسانی لاش کی حرمت کا جو حکم دیا ہے وہ دراصل انسانی جان کی حرمت کا ایک لازمہ ہے۔ ایک دفعہ اگر انسانی لاش کا احترام ختم ہو جائے تو بات صرف اس حد تک محدود نہ رہے گی کہ مردہ انسانوں کے بعض کارآمد اجزا زندہ انسانوں کے علاج میں استعمال کیے جانے لگیں، بلکہ رفتہ رفتہ انسانی جسم کی چربی سے صابن بھی بننے لگیں گے (جیسے فی الواقع جنگ عظیم نمبر ۲ کے زمانے میں جرمنوں نے بنائے تھے)، انسانی کھال بھی اتار کر اس کو دباغت دینے کی کوشش کی جائے گی تاکہ اس کے جوتے یا سوٹ کیس یا منی پرس بنائے جا سکیں (چنانچہ یہ تجربہ بھی چند سال قبل مدراس کی ایک ٹینری کر چکی ہے)۔ انسان کی ہڈیوں اور آنتوں اور دوسری چیزوں کو استعمال کرنے کی بھی فکر کی جائے گی حتیٰ کہ اس کے بعد ایک مرتبہ انسان پھر اُس دورِ وحشت کی طرف پلٹ جائے گا جب آدمی آدمی کا گوشت کھاتا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر ایک دفعہ مردہ انسان کے اعضا نکال کر علاج میں استعمال کرنا جائز قرار دے دیا جائے تو پھر کس جگہ حد بندی کر کے آپ اسی جسم کے دوسرے "مفید" استعمالات کو روک سکیں گے اور کس منطق سے اس بندش کو معقول ثابت کریں گے۔

مطبوعات

سائنس اور ضابطۂ حیات: تالیف: پروفیسر اکرام الدین خان شعبۂ سائنس اسلامیہ کالج، الہ آباد ناشر: مکتبۃ الحسنات رام پور یو پی انڈیا۔ قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے۔ صفحات ۱۴۰۔

اس قابل قدر کتاب میں فاضل مصنف نے بڑے زوردار دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ سائنس انسان کیلئے کوئی ضابطۂ حیات فراہم نہیں کر سکتی۔ انسانی اعمال اور ان کے محرکات کی نوعیتیں اس قدر پیچیدہ اور الجھی

ہوتی ہوتی ہیں کہ انہیں سادہ اجزا کی طرح حل نہیں کیا جاسکتا۔ عقل انسانی اس معاملے میں عاجز ہے اور مشاہدہ اس میدان میں بے بس ہوتا ہے۔ اس بنا پر جو لوگ سائنس پر بے جا اعتماد کر کے یہ کہتے ہیں کہ وہ اس کی مدد سے انسانی مسائل کو پوری طرح حل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے وہ سراسر غلطی پر ہیں۔ انسان رشد و ہدایت کے لئے وحی الٰہی کا محتاج ہے۔ مصنف کا انداز بیان بڑا سادہ اور موثر ہے۔

المنہاج الواضح یعنی راہِ سنت | مولانا ابو الزاہد محمد سرفراز خاں صفدر صاحب۔ صفحات ۲۸۰

قیمت فی جلد ساڑھے تین روپے۔ ناشر: انجمن مدرسہ نصرۃ العلوم۔ گوجرانوالہ

اس کتاب میں فاضل مصنف نے بڑی تحقیق اور عرق ریزی کے ساتھ ان مشہور بدعات کا رد کیا ہے جو معاشرہ کے رگ و پے میں دین کی حیثیت سے سرایت کر چکی ہیں۔ مولانا محترم کا انداز بیان بڑا عالمانہ ہے اور انہوں نے اپنے ہر قول کی تائید قرآن و سنت کے دلائل سے کی ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے قرآن حکیم اور صحیح احادیث کی روشنی میں بدعت لغوی اور شرعی کا مفہوم واضح کیا ہے اور پھر معاشرہ میں مروجہ بدعات مثلاً میلاد، عرس، قبروں پر چراغاں، قبروں کو پختہ بنانا، قبروں پر اذان کہنا اور اسی نوعیت کے دیگر غیر شرعی کاموں پر گرفت کر کے بتایا ہے کہ دین کے ساتھ ان کا قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ یہ محض دین کے نام پر عوام کو دھوکہ دینا ہے۔

گلدستہ سعدی | از مولانا حکیم حسین علوی۔ ناشر: مکتبہ عقیل ۴/۴ مومن پورہ۔ راوی روڈ لاہور۔ صفحات ۲۳۲۔

گلستان سعدی کو دنیا کے اخلاقی ادب میں جو بلند مقام حاصل رہا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ آج سے نصف صدی پیشتر ہر طالب علم اپنی تعلیم کا آغاز اس اخلاق آموز کتاب سے کرتا تھا۔ اس کتاب کے بیشمار تراجم دنیا کی مختلف زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب گلدستہ سعدی اس شہرۂ آفاق تصنیف کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ ترجمہ کا فن یوں بھی بڑا مشکل ہے اور پھر جب پیش نظر نظم کا دوسری زبان میں منظوم ترجمہ ہو تو معاملہ اور بھی پیچیدہ اور مشکل ہو جاتا ہے۔ مولانا حکیم محمد حسین صاحب نے بڑی قابلیت کے ساتھ

اس خدمت کو سرانجام دیا ہے اور وہ اس کام میں خاصے کامیاب ثابت ہوئے ہیں معیارِ کتابت وطباعت عمدہ ہے۔

کتاب انقلاب | جناب اسعد گیلانی صاحب۔ ناشر: آزاد بک ڈپو بلاک نمبر ۲ سرگودھا (پاکستان) ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔

جناب اسعد گیلانی صاحب ملک کے جانے پہچانے ادیب ہیں جن کو خداوند تعالیٰ نے علمی بصیرت کے ساتھ ایک دلِ بیتاب بھی دیا ہے۔ تبصرہ نگار نے جب کبھی اُن کی کسی تحریر کا مطالعہ کیا تو وہ جہاں ایک طرف اُن کے حکیمانہ اسلوبِ نگارش سے متاثر ہوا وہاں اُس نے اُن کے خلوص کی حرارت کو بھی شدت سے محسوس کیا۔

زیرِ تبصرہ کتاب اُن کے چند چھوٹے چھوٹے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں انہوں نے نہایت سلجھے ہوئے مگر ہلکے پھلکے انداز میں اسلام کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ اسلام ایک قوتِ فکر وعمل ہے جو انسان کے افکار کے اندر سلجھاؤ، اس کے قلب کے اندر طمانیت اور اس کے اعمال میں مردِ مجاہد کا سا خلوص اور جوش پیدا کرتی ہے۔

حکمائے قدیم کا فلسفہ اخلاق | تالیف: جناب بشیر احمد ڈار صاحب ایم اے

ناشر: ادارہ ثقافت اسلامیہ پاکستان ۲ کلب روڈ۔ لاہور۔ قیمت چھ روپے

اس فاضلانہ تصنیف میں چینی فلسفہ اخلاق، گوتم بدھ کا فلسفہ اخلاق، بھگوت گیتا کا فلسفہ اخلاق، زرتشت کا فلسفہ اخلاق، مانی کا فلسفہ اخلاق، سقراط کا فلسفہ اخلاق، افلاطون کا فلسفہ اخلاق، ارسطو کا فلسفہ اخلاق، رواقی فلسفہ اخلاق، اور مصری فلسفہ اخلاق کے مختلف گوشوں پر بڑی حکیمانہ اور عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ کتاب کے مصنف چونکہ اخلاق کے اندر اسلامی اقدار کی بالادستی کے نہ صرف قائل بلکہ پرجوش مبلغ بھی ہیں اسلئے انہوں نے اخلاق کے ان مختلف نظریات کی وضاحت کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اخلاق کا اسلامی نقطۂ نظر بھی پیش کیا ہے۔ مصنف کا ذہن رسا اور صاف ہے اسلئے وہ اپنی بات بڑی قرینے سے کہ جاتے ہیں۔

افکارِ اسلامی کی اشاعت کے لیے مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ فرمایئے

۱۔ **اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر** | از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ اسلامی فلسفۂ عبادت کی سائنٹفک توجیہ و تشریح۔ نماز، روزہ پر علمی انداز میں بحث قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔

۲۔ **تجدید و احیائے دین** | از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ مجددین کرام کے تجدیدی کارناموں پر ایک نظر۔ تجدید دین کی ضرورت اور اس کے لوازم پر سیر حاصل بحث قسم اعلیٰ مجلد ۲/۵۰ روپے۔ قسم عام ۱/۷۵ روپیہ۔

۳۔ **داعیٔ اسلام کی حیات طیبہ** | از ابو سلیم محمد عبدالحی۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے عام فہم انداز میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طریقہ سے پیش کیا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے اس کارِ عظیم اور اس تحریک کا بھی ایک نقشہ آتا چلا جاتا ہے جس کو پورا کرنے پر آپ مامور تھے۔ قیمت ۲/۵۰ روپے۔

(۴) **مسلمان کے روز و شب** | از اسعد گیلانی۔ پاکیزہ زندگی گزارنے کے لیے چوبیس گھنٹوں کا پروگرام۔ قیمت ... تین روپے

(۵) **اصلاح معاشرہ میں نماز کا مقام** | از چوہدری بہاول خاں صاحب ناگرہ)۔ اپنی ذاتی اور گرد و پیش کے معاشرے کی اصلاح کے خواہشمند حضرات کے لیے بہترین گائڈ ۲۹/ ا ۔

(۶) **کلمۂ طیبہ** | بچوں اور تعلیم بالغان کے لیے یہ مختصر کتاب نہایت مفید ہے قیمت ۳۱ پیسے

(۷) **سنت خیر الانام** | از صاحبزادہ کرم شاہ صاحب۔ سلیس عبارت اور دل نشیں انداز میں سنت رسولؐ کی حجیت کا ثبوت اور منکرین سنت کے اعتراضات کا جواب ۳/۵۰

ملنے کا پتہ

شعبۂ کتب، ادارۂ ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور

ایک اہم رعایتی اعلان

ہماری چند زیر طبع کتب

۲۵/- روپے — ۲۰/- روپے

اِس رعایت سے فائدہ اٹھائیے

ہم نے اپنی مطبوعات کو زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں پہنچانے اور قارئین کو کم قیمت پر مہیا کرنے کے لیے طے کیا ہے کہ جو حضرات حسب ذیل زیر طبع کتب میں سے ۲۵/- روپے کی کتب یکمشت خریدیں گے اور چھپنے سے پہلے اپنے لیے مخصوص کرا لیں گے۔ ان کو ہم یہ کتب ۲۵ روپے کی بجائے ۲۰ روپے میں مہیا کریں گے پیکنگ اور ڈاک خرچ بھی ان سے وصول نہیں کیا جائیگا۔ بلکہ کمپنی خود برداشت کرے گی۔

★ الجہاد فی الاسلام	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (نیا ایڈیشن (ترمیم و اضافہ کے ساتھ))	مجلد ۱۰.۵۰	سستا [illegible]
★ تفہیمات (حصہ اول)	"	۷.۵۰	۵.۵۰
★ پردہ	"	۵.۵۰	۳.۵۰
★ اسلامی نظام زندگی	مرتبہ	۹.۰۰	۶.۰۰
★ اسلامی ریاست		۱۲.۰۰	۸.۰۰
★ اسلام کا نظام حیات	"	(بڑے پر پرنٹنگ)	۱.۰۰

- مخصوص کرانے کے لیے ۲۵ فیصدی رقم پیشگی آنا ضروری ہے۔
- یہ رعایت صرف ۱۵ فروری ۱۹۶۲ء تک موصول شدہ فرمائشوں پر ہوگی۔ اس کے بعد یہ رعایت نہیں دی جائے گی
- فرمائش کے وقت اشتہار کا حوالہ ضرور دیں۔

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، ۱۱۔سی شاہ عالم مارکیٹ لاہور